سلسلہ انجمن ترقی اردو نمبر ۱۰۱

مقالات حالی



حصہ دوم

جسمیں مولینا حالی کی تقریریں اور کتابوں کے
تبصرے جمع کیے گئے ہیں

انجمن ترقی اردو کیلیے

جامع برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی



قیمت مجلد عا ر　　بار اول ۱۵۰۰ سنہ ۱۹۳۶ء　　غیر مجلد عہ

ردو

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ ہے۔

جس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ اس کے تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرے اس رسالہ کی ایک خصوصیت ہے۔

یہ رسالہ سہ ماہی ہے۔ اور ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ رسالے کا حجم تقریباً ایک سو پچاس صفحات ہوتا ہے اور اکثر اس سے زیادہ۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکّہ انگریزی (معہ) آٹھ روپے سکّہ عثمانیہ (عہ)

قیمت فی پرچہ مع محصول ڈاک ایک روپیہ بارہ آنے (عہ) سکّہ انگریزی۔ دو روپے سکّہ عثمانیہ (عہ)

المشتہر

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن



فہرست مضامین

فہرست تقریظات حالی

ا۔ ”ہمدردی“ پر ایک لکچر

مولانا کا یہ لکچر ”دہلی سوسائٹی“ کے عظیم الشان جلسہ واقع ۲۱ اپریل ۱۸۶۷ء میں ہوا تھا۔ اور ”انجمن مفید عام قصور“ کی طرف سے جو ماہوار رسالہ شائع ہوتا تھا اُس کے ماہ اپریل ۱۸۶۷ء کے پرچے میں چھپا تھا۔

یہ جلسۂ مبارک جس میں مختلف قوموں کے ممتاز اور جلیل القدر آدمی جمع ہیں اور ظاہر اُن کا تشریف لانا کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں معلوم ہوتا، انسان کی اُس خصلت کا ایک عمدہ نمونہ ہی جس پر مجھکو اس وقت بحث کرنی منظور ہے، اور جو آج کل ہمدردی کے نام سے مشہور ہے۔ ہمدردی کا لفظ ہم اور درد دو فارسی کلموں سے مرکب ہی۔ درد کے معنی دُکھ اور تکلیف کے ہیں اور ہم کا لفظ اشتراک کے معنی دیتا ہی۔ پس ہمدردی کے لفظ سے دو یا کئی شخصوں کا دُکھ اور تکلیف میں شریک ہونا ظاہر ہوتا ہے، خواہ ارادہ سے ہو خواہ بے ارادہ، مگر آج کل کے استعمال میں ہمدردی سے وہ شرکت مراد لیجاتی ہے جو ارادہ سے کیجائے مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور دوسرا رحم یا محبت سے اُس کی دوا دارو کرتا ہے، تو دوسرے کو پہلے کا ہمدرد کہیں گے۔

ہمدردی پر جس قسم کی بحث فلاسفی میں کی گئی ہی اُس کا ذکر کرنا شاید اس موقع پر مناسب نہ ہوگا۔ پس میں اُس کی ماہیت بیان کرنے کی نسبت زیادہ تر اُس کے نتائج سے بحث کرونگا۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ تمام انسان اصل میں ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں اور ایک ہی دریا کے مختلف شعبے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ تمام انسان ایک دوسرے کی ہمدردی

کے ذمہ دار ہیں، اور ہر شخص مصیبت کی حالت میں اپنے ہمجنسوں سے مدد لینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ کون ہے جو اس بات سے انکار کرے گا کہ بھائی کو بھائی سے ایک تعلق ہے جو ایک کو دوسرے کی ہمدردی پر مجبور کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُن بھائیوں کی اولاد میں اُس ہمدردی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے۔ بیشک جبتک کہ باپ کے خون کا قطرہ اولاد کی رگ و پے میں باقی ہے ہمدردی کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ ہمدردی اور حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے۔ بچوں کو ایک مدت تک پرورش کرنا، اُن کے لئے غذا بہم پہنچانی، تا بمقدور ان کو دشمن کے حملہ سے بچانا سب جانوروں کی عام خصلت ہے۔ اس کے سوا عام ہمدردی بھی اُن میں دیکھی گئی ہے۔ جنگلی بطخوں کا غول جب کسی کھیت میں اُترتا ہے اور وہاں کسی طرح کا کھٹکا نہیں پاتا تو سب کے سب ایک صف باندھ کر دانہ چُگتے ہیں۔ مگر اُن میں سے ایک ایک بطخ نوبت بہ نوبت اپنے ہمجنسوں کی چوکسی کرتی ہے اور جب تک پہرا دیتی رہتی ہے ایک دانہ نہیں کھاتی۔ چیونٹا جب کہیں اناج کا ذخیرہ پاتا ہے تو کبھی تن پروری نہیں کرتا بلکہ اُسی وقت اپنے ہمجنسوں کو خبر کر دیتا ہے اور تھوڑی سی دیر میں لاکھوں چیونٹوں کو وہاں جمع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ ہمدردی انسان کی طبیعت میں بھی ضرور رکھی گئی ہے۔ کیونکہ جو خوبیاں قدرت نے اور حیوانات کو عنایت کی ہیں انسان اُن کا زیادہ تر مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی ایک قدرتی خاصیت ہے جو بغیر تعلیم اور اکتساب کے انسان کی طبیعت میں خود بخود جوش مارتی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اور حیوانات میں جو عقلی تعلیم سے بالکل محروم ہیں اس کا وجود ہرگز نہ پایا جاتا۔

ہمدردی انسان میں اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ کارخانۂ دنیا کا انتظام برہم نہ ہونے پائے کیونکہ انسان اپنی ضروریات میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، ایک کی گاڑی دوسرے کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی۔ سب سے زیادہ حقیر حلال خور کی قوم سمجھی گئی ہے مگر وہ بھی ایسی ضروری جماعت ہے جس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ پس اگر انسانوں میں ہمدردی نہ ہو تو یہ تمام

کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

شاید یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ دنیا میں جو کام اپنی ذاتی اغراض کے لئے کئے جاتے ہیں وہ ہمدردی میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسان زمین کے بونے جوتنے میں جو کوشش کرتا ہے اور بیوپاری جو مال بھر کر سیکڑوں کوس لیجاتا ہے اُس سے اگرچہ اوروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے مگر اُن کا اصل مقصود اپنا ذاتی فائدہ ہے پس اس کو ہمدردی کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو خصلتیں انسان کو قدرت نے تعلیم کی ہیں وہ کبھی اُس کے فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ پس ہمدردی جو کہ آدمی کی قدرتی خاصیت ہے اُس کے فائدے سے خالی نہیں ہو سکتی۔ جو شخص کسی اپنے ہمجنس کو نفع پہنچاتا ہے وہ حقیقت میں اپنی آسائش کے کسی وسیلہ کو تر و تازہ کرتا ہے اور ایک یا چند واسطوں سے اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں تھیاوالے جو کہ دریائے ڈنیوب اور ٹائبر کے درمیان بستے تھے جب اُن کے بڑے بوڑھے اپنے بال بچوں کو باہم ہنستے بولتے ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک پاتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ نہایت عمدہ ترکہ جو ہم اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جائیں گے وہ یہی ہمدردی ہے جس کے آثار ہماری اولاد میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے ہموطن بھی ہمدردی کی اصل سے بے خبر نہیں ہیں۔ کوئیں بنوانے، پیاؤ بٹھانی، سبیل لگانی، محتاجوں کی خبر لینی، بیواؤں کی مدد کرنی، بیاہ شادیوں میں شریک ہو کر ایک دوسرے کا کام بٹوانا، بیمار کی عیادت، میت کی تعزیت اور اسی طرح اور بہت سی باتیں ہمارے ملک میں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ قدرتی خصلت جس کا نام ہمدردی ہے مشق اور تعلیم سے تمام قوم میں پھیل جاتی ہے اور اس کا اثر کسی قدر تیز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لائی کرگس اور سولن جو یونان کے دو بڑے مقنن گزرے ہیں، انھوں نے اسپارٹا اور ایتھنز والوں کی ترقی کے لئے جہاں اور بہت سی تجویزیں کی تھیں، اُنھیں میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ لوگوں کو طرح طرح سے ہمدردی کی ترغیب دی جائے۔ چنانچہ اسی خیال سے لائی کرگس نے اول اسپارٹا

میں تمام اراضی برابر حصوں پر تقسیم کر دی تاکہ رعایا میں دولت و افلاس کا فرق باقی نہ رہے اور ایسی صورت ہو جائے کہ جیسے ایک ماں جائے بھائی اپنے مورث کے ترکہ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں ۔ پھر یہ قاعدہ جاری کیا گیا کہ لوگ گھروں میں کھانا چھوڑ دیں بلکہ سب آپس میں مل جل کر کھانا کھایا کریں اور ہر شخص یہ خیال رکھے کہ ساتھیوں میں سے کوئی بھوکا تو نہیں رہا ۔

سولن نے ایتھنز میں یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جب کوئی شخص کسی کو تکلیف پہنچائے تو دیکھنے والا مغلوب کی مدد کرے اور غالب کو سزا دلوا دے تاکہ لوگوں کو ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہونے کی عادت پڑے اور ساری رعیت ایک خاندان کے آدمی ہوں ۔ اس کے سوا یہ بھی حکم تھا کہ جو لوگ رفاہِ ملک کے جلسوں میں شریک نہ ہوں اور اس بات کے منتظر رہیں کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے وہ جلاوطن کئے جائیں اور ان کی جائداد ضبط کیجائے ۔ ان تجویزوں سے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا جوش بہت ہو گیا تھا اور ہر شخص یہ جانتا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہیں ۔

ہم کو بھی ہماری گورنمنٹ طرح طرح سے ہمدردی کی تعلیم دے رہی ہے ۔ قومی ہمدردی کا بڑا سرچشمہ سررشتہ تعلیم ہے کیونکہ اس کے سبب سے بے شمار لڑکوں کو ایک معقول مدت تک باہم میل جول رکھنا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کا بیج بو یا جاتا ہے ۔ پس ضرور ہے کہ جب وہ مدرسہ چھوڑ کر ملک میں متفرق ہوں، ان کا تعلق اور رابطہ ہمیشہ برقرار رہے ۔ اس کے سوا گورنمنٹ کا یہ اصول کہ جو چندہ علوم یا فنون کی تعلیم کے لئے رعایا کی طرف سے فراہم ہو اُسی کی برابر گورنمنٹ کی جانب سے امداد کی جائے، ہم کو زبردستی اس بات کی طرف کھینچتا ہے کہ تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلا کر گرانٹ اِن ایڈ کا استحقاق حاصل کریں اور اپنے ملک میں علم کی روشنی پھیلائیں ۔

میونسپل کمیٹیاں جو سرکار نے جابجا شہروں اور قصبوں میں قائم کی ہیں، اگر پورا پورا اپنا فرض ادا کریں اور جس غرض کے لئے مقرر ہوئی ہیں اُسی کو مدنظر رکھیں تو یہ بھی ہمدردی کے اچھے

نمونے ہیں۔

علمی یا قومی سوسائٹیاں جن کی بنیاد صرف انگلش گورنمنٹ کے پرتو سے ہندوستان میں پڑی ہیں، اگر اُن میں کچھ جان ہو اور فقط دھوکے کی ٹٹیاں نہ ہوں تو وہ سرچیون چشمے ہیں جن سے تمام ملک سیراب ہو سکتا ہے۔

زمانہ بھی طرح طرح سے ہم کو ہمدردی کی طرف مائل کر رہا ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم جو ہماری خوش قسمتی سے ہم پر حکمراں ہے، اُس کا چال چلن، اُس کے اخلاق، اُس کا طرز معاشرت، اُس کے علوم و فنون، اُس کی دانشمندی، اُس کی تہذیب، اُس کے نئے نئے ایجادات، جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جب ان باتوں کو اپنے ملک کی موجودہ صورت کے ساتھ مقابلہ کریں تو ضرور ہے کہ ہم کو اپنی اور اپنے ہموطنوں کی نہایت وحشیانہ حالت پر افسوس آئے اور ہمدردی کا جوش ہمارے دلوں میں موجزن ہو۔

مذہب بھی ہم کو بہت زور سے ہمدردی کی طرف کھینچتا ہے۔ ہندو مسلمان اگر اپنی مذہبی کتابیں دیکھیں گے تو اُن کو ہمدردی کی ترغیب سے مالا مال پائیں گے۔

یہ تمام تقریر جو اب تک کی گئی ہے اس سے تین باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ قادر مطلق نے اپنے ہمجنسوں کی ہمدردی انسان کی سرشت میں پیدا کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمدردی کا عمل درآمد قدیم سے کسی نہ کسی قدر ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ بہت سے اسباب ہمارے دائیں بائیں ایسے موجود ہیں جو ہر وقت ہم کو ہمدردی کی ترغیب دلاتے ہیں، پس ہمارے ہموطنوں میں اعلیٰ درجہ کی ہمدردی پائی جانی چاہئے۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھئے تو وہ بے سمجھ چیونٹا جو اپنی فتوحات سے ساری قوم کی پرورش کرتا ہے اور وہ نادان لطخ جو اپنے ساتھیوں کی نگہبانی میں گھڑیوں ایک ٹانگ سے کھڑی رہتی ہے ہم سے بہت زیادہ اس فخر کی مستحق ہے۔ ہمارے ملک میں تین قسم کے آدمی ہیں۔ ایک دولتمند، دوسرے تعلیم یافتہ، تیسرے وہ جو نہ دولتمند ہیں نہ تعلیم یافتہ۔ پچھلے گروہ سے ملک کو کوئی عام فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر پہلے

دونوں گروہوں کو ملک کی ترقی اور بہبودی میں اُسی قدر دخل ہے جیسے گورنمنٹ کو۔ بہت سے فائدے ایسے ہیں جو ملک کو بغیر اُن کی کوشش کے ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ مگر ہمارے وطن کے یہ دونوں معزز گروہ آج تک ملک کے حقوق سے کچھ بھی سبکدوش نہیں ہوئے۔ دولتمندوں میں اکثر بے پروائی سے اور بعضے اس خیال سے کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے۔ ہموطنوں کی بھلائی کا خیال نہیں کرتے۔ اور جو لوگ بے پروائی سے ادھر متوجہ نہیں ہوتے اُن سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر ان کو اپنے ہموطن بھائیوں کی پروا نہیں ہے تو کیا اس بات کی بھی پروا نہیں ہے کہ اُن کی دولت کی ترقی ہو، اُن کی عزت گورنمنٹ میں زیادہ ہو، اُن کی اولاد علم اور لیاقت حاصل کرے، اُن کے خاندان کی عزت آبرو ہمیشہ بنی رہے۔ اگر اُن کو یہ تمام خواہشیں ہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ بغیر قومی ترقی کے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جبتک تمام قوم کسی نہ کسی قدر عزت کا استحقاق حاصل نہیں کرتی، اُس قوم کے چند آدمی اصلی عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی علم کا سلسلہ کسی خاندان میں قائم نہیں رہ سکتا جبتک تمام قوم کے اخلاق درست نہیں ہوتے کوئی شخص خاندان کے اخلاق کی حفاظت نہیں کر سکتا جب تک تمام قوم مرفہ الحال نہیں ہوتی کوئی شخص دولت وحشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔

قوم ایک درخت کی مثال رکھتی ہے جس کی ٹہنیاں اُس کے مختلف خاندان ہیں اور اُس کے پتے ہر ایک خاندان کے مرد وعورت۔ جب تک درخت کی جڑ ہری ہے اُس کی ٹہنیاں اور پتے بھی ہرے ہیں لیکن جب جڑ کو پانی نہ پہنچے گا ٹہنیاں اور پتے سب سوکھ جائیں گے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کوشش سے تمام ملک کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے، ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ صرف دو خیال ہیں جنھوں نے دنیا کے تنزل اور ترقی پر بہت کچھ اثر کیا۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ سب کچھ کر سکتے ہیں پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال نے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر کئے۔ کیمبرج یونیورسٹی جس

کی آج تمام دنیا میں دھوم ہے، اُس کی بنیاد صرف اس طرح پڑی تھی کہ قصبہ کیمبرج میں جو کہ لندن سے قریب ساٹھ میل کے واقع ہے ایک باہمت پادری نے اپنے ہموطنوں کی تعلیم کے لئے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا تھا اور کسی قدر اپنی جائداد اس کے خرچ میں لگا دی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس میں ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اُس کی بدولت تمام برطانیہ میں علم کی روشنی پھیل گئی۔ اب وہاں بہت بڑے بڑے سولہ کالج ہیں جن میں تقریباً تین ہزار آدمی ہزار ہزار روپیہ ماہوار تک کے نوکر ہیں۔ اگر وہ جوانمرد پادری جس نے اس بڑے دارالعلم کی بنیاد ڈالی تھی یہ خیال کرتا کہ میری کوشش سے کیا ہو سکتا ہے تو کیمبرج جو آج تمام دنیا میں مشہور ہے اُس کا کوئی نام بھی نہ جانتا اور لاکھوں آدمی جو اُس کی بدولت امیر کبیر ہوئے یا حکیم اور فلاسفر کہلائے اُن کا کوئی ذکر بھی نہ کرتا۔ اسی طرح بے شمار مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ ایک ایک آدمی کی کوشش سے ملک کے ملک سرسبز و شاداب ہو گئے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ جو درحقیقت قومی ترقی کے ضروری آلات ہیں اور جن کی توجہ سے ہمارے عقدے بہت آسانی سے حل ہو سکتے ہیں انھوں نے بھی آج تک ملک کو کچھ ممنونِ احسان نہیں کیا۔ سستی اور بے پروائی جو اس ملک کا خاصہ ہے، اُن میں بھی ویسی ہی پائی جاتی ہے جیسے اُن کے عام ہموطنوں میں۔ وہ اپنے نامہذب ہموطنوں میں عیب نکالتے ہیں مگر اُن کے عیب دور کرنے میں کوشش نہیں کرتے۔ وہ اُن کو ہاف نیٹو سولائزڈ کہہ کر جتنا تعجب کرتے ہیں اتنا افسوس نہیں کرتے۔ اس قابلِ ادب جماعت میں بھی کئی قسم کے آدمی ہیں۔ ایک وہ جو تعلیم کو فقط نوکری کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جب ان کو لیاقت کی سند حاصل ہو جاتی ہے پھر علم اور کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ ان لوگوں سے ہم وہ امید نہیں رکھ سکتے جو کہ ایک تعلیم یافتہ گروہ سے رکھنی چاہیے، کیوں کہ ان پر تعلیم کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ دوسرے وہ لوگ جنھوں نے واقعی علم کو علم ہی سمجھ کر سیکھا ہے، مگر وہ اپنے ذوق و شوق میں ایسے غرق ہوئے کہ انھوں نے صحت اور طاقت کا کچھ لحاظ نہ کیا اور اپنی حد سے بہت آگے بڑھ گئے۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ دل و دماغ نے ان کو جواب دے دیا اور ان کو بہ مجبوری مطالعہ کتاب سے

ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اُن سے بھی ہمارا کچھ کام نہیں چل سکتا، کیونکہ وہ خود اپنے کام میں درماندہ ہیں۔ تیسرے وہ جنھوں نے علم کو علم بھی سمجھا اور اپنے قومی کو بھی محفوظ رکھا اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی کتاب کو ہاتھ سے نہیں ڈالا، یہ لوگ البتہ بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ بھی کچھ نہیں کرتے جن باتوں کی آج ہندوستان میں ضرورت ہے اُن کے سامان انگریزی زبان میں ہماری ضرورت سے بہت زیادہ موجود ہیں۔ اور سردست ہم کو اس بات کی حاجت نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے ملک میں بھی بیکن اور نیوٹن جیسے عالی دماغ پیدا ہوں۔ بلکہ اب صرف ان کی تحقیقات کو اپنی زبان میں لانا ہے، گویا خرمن بالکل تیار ہے اور اس کی تیاری میں جو مشکلیں پیش آنی تھیں وہ آچکیں۔ خرمن کے مالکوں نے اُس کو سب لوگوں پر وقف کر دیا۔ اب جن کے پاس باربرداری کا سامان موجود ہے وہ اس کو بھریں اور قحط زدہ ملک میں پہنچائیں پس اگر ہمارے لائق و فائق ہموطن کچھ بھی توجہ کریں تو اپنے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

ہندوستانیوں سے عموماً دو قومیں مراد لیجاتی ہیں۔ ایک ہندو دوسرے مسلمان۔ یہ دونوں اپنے اپنے وقت شائستگی کے اعلیٰ درجہ کو پہنچ چکے ہیں۔ ہندوؤں کی شائستگی اس وقت میں مانی گئی ہے جبکہ تمام دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہومر شاعر نے اس زمانہ کے یونانیوں کا حال مفصل لکھا ہے، جبکہ منو کا مجموعہ تالیف ہوا۔ اُس زمانے میں جو حال ہندوستان اور یونان کا تھا اُس کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو اگرچہ ہمت اور دلاوری میں یونانیوں کے برابر نہ تھے مگر عام تہذیب اور شائستگی اور قوانین کی عمدگی اور انتظام کی خوش اسلوبی اور علم و ہنر کی ترقی میں یونانیوں سے بہت بڑھ کر تھے۔ مسلمانوں کی ترقی کے زمانہ کو کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا۔ یورپ کے اکثر مورخوں نے جو مسلمانوں کی ترقیات کا حال لکھا ہے وہ ہماری موجودہ حالت سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس زمانہ میں اس پر مشکل سے یقین آتا ہے اور ہم کو شرم آتی ہے کہ اس پستی اور تنزل کی حالت میں اپنے بڑوں کی ترقیات

فخریہ بیان کریں۔ لیکن اس قدر کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ زمانۂ متوسط میں صرف مسلمانوں ہی کی قوم ایسی تھی جو شائستگی اور روشن ضمیری اور اولوالعزمی میں دنیا کی تمام قوموں سے افضل تھی۔ فرانس کا ایک نامی مورخ لکھتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے عرب کی قوموں کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کو ان مختلف قوموں تک پہنچائیں جو فرات کے کنارے سے لیکر ہسپانیہ کی وادی کبیر تک پھیل رہی ہیں۔ ہندوا ور مسلمانوں کا یہ حال جو میں نے عرض کیا اس سے کچھ اپنی بڑائی ظاہر کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ اپنے ہموطنوں کو عبرت دلانی اور یہ جتانا منظور ہے کہ جن لوگوں کی وہ اولاد کہلاتے ہیں وہ اپنے زمانے میں سب سے آگے تھے اور یہ سب سے پیچھے ہیں۔ حالانکہ جو امن و آزادی انگلش گورنمنٹ کی بدولت ان کو میسر ہے وہ ان کے بزرگوں کو کبھی میسر نہیں ہوئی۔ پس اگر اب بھی اُن سے کچھ نہ ہوا تو پھر کبھی کچھ نہ ہوسکے گا۔ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ ہمارے ملک میں کہیں کہیں وطن دوست آدمی کھڑے ہوئے ہیں اور انھوں نے عام ہمدردی کا حق پورا پورا ادا کیا ہے۔ اُن کی کوششوں سے چندے جمع ہوئے ہیں اور قومی ترقی کے لئے مجلسیں قائم ہوئی ہیں، اُن کی سعی بھی کسی قدر بارور ہوئی ہے اور کچھ لوگ اُن کی بدولت خواب غفلت سے بیدار ہوئے ہیں۔ مگر جب ہم اپنی اندرونی اور بیرونی خرابیوں کا اندازہ کرتے ہیں تو یہ تمام کوششیں اُن کے سامنے ایسی بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں جیسے اندھیری رات کی تاریکی کے آگے جگنو کی چمک ہمارے اخلاق، ہمارا طریق معاشرت، ہمارے علوم و فنون، ہماری تجارت، ہماری دستکاری غرض ہمارے سب کام ایسی پستی کی حالت میں ہیں کہ اُن کے ابھارنے کے لئے نہایت زبردست طاقتیں درکار ہیں۔

جو باتیں ہماری ترقی کی مانع ہیں اُن پر میں نے کبھی کبھی غور کی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ کسی روز سب صاحبوں کے سامنے اُن کو مفصل بیان کروں۔ مگر ایک امر جس کو میں مانع قومی سمجھتا ہوں، یہاں مختصر طور پر عرض کرتا ہوں۔ اب تک جو تدبیریں ہماری ترقی

کے لئے کی گئیں اور کیجاتی ہیں اگرچہ اُن کے ضروری ہونے میں کچھ کلام نہیں ہے اور وہ بیشک اس قابل ہیں کہ جب موقع ملے کوشش کیجائے۔ لیکن انگریزی رائیں غلط نہیں تو اکثر اُن میں سے ایسی ہیں جو بالفعل عام رایوں اور عام خواہشوں کے برخلاف معلوم ہوتی ہیں اور اسی سبب سے جن لوگوں کی بہبودی کے لئے وہ کیجاتی ہیں اکثر وہی اُن میں رخنہ انداز ہوتے اور تقریباً تمام قوم اُن میں مدد دینے سے انکار کرتی ہے۔ پس میرے نزدیک جو تدبیریں عام بہبودی کے لئے کیجائیں وہ بالمقدور ضرور ایسی ہونی چاہئیں جن کے نتائج اور فوائد عام لوگوں کی سمجھ میں بآسانی آ جائیں۔ مثلاً بالفعل بہ نسبت اس کے کہ ایک مدرسہ فزیکل سائنس کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے، بہتر ہے کہ ایک تعلیم خانہ صنعت اور دستکاری کے لئے کھولا جائے۔ کیونکہ پہلی صورت کی نسبت دوسری صورت عام خواہشوں کی زیادہ پورا کرنے والی ہے۔ یا مثلاً پہلے اس سے کہ بیاہ شادیوں کی فضول خرچیاں بند کی جائیں بہتر ہے کہ موت اور غمی کے اخراجات موقوف کئے جائیں۔ کیونکہ پچھلی تجویز عام رایوں کے موافق زیادہ کارگر معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔

۲- ایڈریس باشندگان دہلی بحضور وائسرائے

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

یہ ایڈریس گورنمنٹ انگریزی کے افغانستان کی جنگ میں تسخیر پانے کے بعد ۱۸۷۹ء میں باشندگانِ دہلی کی طرف سے ہزایکسلنسی رائٹ آنریبل اڈورڈ رابرٹ لٹن بلورلٹن بیرن لٹن آف نیب ورتھ جی-ایم-ایس-آئی گورنر جنرل ہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ مسودہ مولانا نے بنا کر دیا تھا۔

اس بات کو بہت تھوڑا زمانہ گذرا ہے کہ ہم باشندگانِ دہلی وفادار رعایائے حضور ملکہ معظمہ سلطنتِ برطانیہ عظمیٰ وقیصر ہند دام اقبالہا آپ کو بحیثیت نائب السلطنت ہونے کے ایک ایسے شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ اورنگ قیصری پر جلوہ افروز دیکھ چکے ہیں جس کی نظیر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ ابھی وہ خوشی اور مسرت اور افتخار جو کہ ہم رعایائے دہلی کو دربارِ قیصری کے منعقد ہونے سے حاصل ہوا تھا ہمارے دل سے فراموش نہ ہونے پایا تھا کہ ہم نے حضور والا کو ایک ایسی فتح نمایاں کے بعد جس سے سراسر ہندوستان کی بہبودئ حال و مآل متصور ہے دیکھا۔ پس ایسے مبارک موقع پر جو بے انتہا شکر گذاری اور احسانمندی اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا جوش ہمارے دل میں خود بخود پیدا ہوا ہے اُس کا ظاہر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ افغانستان کی مہم نہ خزانہ سرکاری کی توفیر اور نہ محاصل ملکی کی افزائش کے واسطے اختیار کی گئی تھی بلکہ صرف اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ ہندوستان کے امن و امان میں جو رخنے نظر آتے ہیں وہ مسدود کئے جائیں اور شمالی خدشوں کی روک ٹوک کے لئے ہندوستان کی سرحد کو استحکام دیا جائے۔ ہم کو اس میں کچھ شک اور شبہ

نہیں ہے کہ فوج سرکاری کو اس مہم کے اختتام تک جس قدر دقتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جلیل القدر افسروں کی بیش قیمت جانیں جو ایک وحشی قوم کی ناعاقبت اندیشی سے تلف ہوئی ہیں یہ سب کچھ ملک اور رعیت کی حفاظت اور نگہبانی کے لئے تھا۔ پس ہمارا ضروری اور نہایت ضروری فرض ہے کہ ہم دل سے، زبان سے اور بدن کے رونئیں رونئیں سے گورنمنٹ ہند کا شکریہ ادا کریں۔ اور جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ ہند کو اپنی صائب پالیسی کے برقرار رکھنے میں کیسی کیسی سخت مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے تو یہ شکرگذاری اور احسانمندی دوچند بلکہ چہار چند ہو جاتی ہے۔

ہمکو معتبر وسیلوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت افغانستان سے انگریزی سفارت کی مزاحمت وقوع میں آئی اُس وقت خاص کابل میں ایسے سامان جمع تھے کہ اگر چند روز اس مہم میں اور توقف کیا جاتا تو شرو فساد کی بنیاد کسی قدر زیادہ پائدار ہو جاتی اور افواج قاہرہ کو اُس کے رفع دفع کرنے میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی۔ لیکن گورنمنٹ ہند نے ایشیا کے اس مشہور قول پر ”کار امروز بفردا مگذار“ پورا پورا عمل کر کے ملک اور رعیت کو تاخیر و التوا کے مضر نتائج سے بالکل محفوظ کر دیا۔

افغانستان کی مہم جو کہ حضور کی دلیرانہ تدبیر سے عمل میں آئی ہے جس قدر گورنمنٹ انگلشیہ کی اولوالعزمی اور سطوت و جلالت پر گواہی دیتے ہیں اُس سے زیادہ اُس کی بُردباری، تحمل، چشم پوشی اور فراخ حوصلگی پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انگلستان کی بہادر قوم نہ صرف اپنی اولوالعزمی اور شجاعت سے بلکہ زیادہ تر اپنے بے نظیر تحمل و استقلال اور بے مثل عدل و انصاف اور عجیب بُردباری اور حلم سے دنیا کے پانچوں برّاعظموں پر حکمراں ہوئی ہے۔ وہ کسی پر ایک تنکا نہیں اٹھاتی جب تک کوئی اُس پر شہتیر نہ اٹھائے۔ وہ کسی پر ایک وار نہیں کرتی جب تک اس پر بہت سے وار نہ کئے جائیں۔ ہم وفادار رعایائے حضور قیصر ہند آپ کو اس مبارک فتح کی بابت جو کہ آپ کی رائے

صائب اور آپ کے معزز مشیروں کی اور آپ کے جلیل القدر سپہ سالاروں کی سرگرمی اور آپ کی افواج قاہرہ کی بہادری سے وقوع میں آئی اور جس کے نتائج بادشاہ اور رعیت دونوں کے حق میں بے انتہا برکتوں سے معمور ہیں مبارکباد دیتے ہیں، اور نہایت خلوص سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اس شہر کی تجارت اور صنعت روز بروز ترقی پکڑتی جاتی ہے۔ اور اگرچہ یہاں کی تعلیم کے وسائل کسی قدر کم ہو گئے ہیں لیکن یہاں کے عام باشندے خود اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے پر روز بروز آمادہ ہوتے جاتے ہیں

البتہ چند سال سے نامعلوم قدرتی اسباب ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہر سال موسم برسات اور موسم سرما میں یہاں بیماریوں اور اموات کا شمار حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن بالفعل میونسپل کمیٹی اس باب میں غور کر رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حفظان صحت کے کافی وسائل مہیّا کئے جائیں۔ امید ہے کہ جو کام میونسپل کمیٹی کی طاقت سے باہر ہو گا وہ گورنمنٹ کی امداد اور اعانت سے سرانجام ہو جائے گا۔

۳۔ تقریر جلسہ تعزیت حکیم محمود خاں

(منقول از رسالہ "مرثیہ حکیم محمود خاں" مطبوعہ ۱۸۹۲ء)

حکیم محمود خاں مرحوم کے نام سے کون واقف نہیں۔ دہلی کے نہایت حاذق طبیب تھے اور سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے انتقال پر مولانا حالی نے نہایت پُراثر اور پُردرد مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ صرف حکیم محمود خاں کا نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دہلی اور سلطنت اسلامیہ کا مرثیہ ہے۔ دہلی کے رؤسا اور عمائدین اور حکیم صاحب مرحوم کے عقیدتمندوں نے پُرزور تحریک کی کہ ایک جلسۂ عام حکیم صاحب کی تعزیت میں منعقد کیا جائے اور اس میں خود مصنف محترم کی زبان سے یہ مرثیہ سنا جائے۔ لیکن اُسی زمانے میں مولانا بیمار ہو کر تبدیل آب و ہوا کے لئے پہاڑ پر چلے گئے دو تین مہینے کے بعد جب سفر سے واپس آئے تو ۲۰ محرم سنہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴ اگست سنہ ۱۸۹۲ء بروز یکشنبہ ایک جلسہ مفتی محمد صدرالدین خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی پر منعقد کیا گیا اور اس میں مولانا نے یہ مرثیہ پڑھا جس سے اہل جلسہ بے انتہا متاثر ہوئے۔ مندرجہ ذیل تقریر وہ ہے جو مرثیہ پڑھنے سے پہلے "مرثیہ لکھنے کی ضرورت" پر مولانا نے فرمائی تھی:۔

مسلمانوں میں مرثیہ لکھنے کا رواج ابتدائے اسلام سے پایا جاتا ہے اور اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی عزیزوں، دوستوں اور مشہور لوگوں کے مرثئے برابر لکھے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدّ بزرگوار عبدالمطلب کے بہت سے مرثیے اب تک موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کسی شخص کی نیکی، بزرگی اور مقبولیت کا ثبوت جیسا کہ مرثیہ کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ جو تعریف کسی کے مرنے کے بعد کیجاتی

ہے، اُس پر بناوٹ یا تصنع کا گمان ہرگز نہیں ہو سکتا۔ عرب کے شعرا کو جب دل سے کسی کی سچی اور بے ریا تعریف کرنی ہوتی تھی تو اس کے مرنے کے بعد مرثیہ لکھتے تھے معن بن ائدہ شیبانی جو کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ایک نہایت فیاض اور شجاع سپہ سالار گذرا ہے، اُس کے بے شمار مرثئے لکھے گئے ہیں۔ ایک شاعر نے اُس کے مرثئے میں لکھ دیا تھا کہ فیاضی اُس کے ساتھ رخصت ہو گئی، اب کس سے فیاضی کی امید رکھیں۔ خلیفہ مہدی نے اس جرم میں اُس کو دربار سے نکلوا دیا اور امرا نے اس کو صلہ دینا موقوف کر دیا۔ مگر اس پر بھی شعرا معن کے مرثیے برابر لکھتے رہے۔ جعفر برمکی کو جب ہارون رشید نے قتل کروایا تو اُس کے مرثئے لکھنے پر بہت سے شاعروں کو موت کی سزا دی گئی، مگر پھر بھی لوگ اُس کے مرثئے لکھنے سے باز نہ آئے۔

فی الواقع کسی شخص کی شکر گذاری اور احسانمندی کے اظہار کا موقع اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کی وفات پر افسوس کیا جائے اور اُس کا ذکر جمیل ملک میں پھیلایا جائے۔

اسلام میں بلکہ شاید تمام دنیا میں کوئی واقعہ واقعۂ کربلا سے زیادہ عالم آشوب اور دردناک وقوع میں نہیں آیا۔ اور اسی لئے فی زمانا مسلمانوں میں مرثیہ کا اطلاق صرف جناب سید الشہدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرثیوں پر ہونے لگا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مرثیوں کے سننے سے ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور خاندانِ نبوت کی محبت جو کہ اسلام کی جڑ ہے دلوں میں موجزن ہوتی ہے اور شہدائے کربلا کے صبر و استقلال کی پیروی اور اتباع کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور اسی لئے قوم کے اکثر بزرگواروں نے واقعۂ کربلا کے بیان میں اپنی عمریں تمام کر دی ہیں اور قوم کے رونے اور رُلانے کے لئے اس قدر ذخیرے چھوڑ گئے ہیں کہ اب کسی شخص کو ان مضامین کے دہرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن اس زمانہ میں کہ مسلمانوں کی قومی بندش ڈھیلی ہو گئی ہے اور تمام جماعتوں میں

تفرقے پڑے ہوئے ہیں، اُن میں ہمدردی کا بیج بونے اور قومیت کی روح پھونکنے کی ازبس ضرورت ہے۔ جہاں اس کی اور بہت سی تدبیریں ہیں ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ قوم میں سے جب کوئی قوم کا محسن اور خدمتگذار گذر جائے تو اُس کی زندگی کے حالات قلمبند کئے جائیں، اُس کی خوبیاں اور اُس کے محاسن ملک میں شائع کئے جائیں اور شعرا جو کہ قوم کی زبان ہیں، تمام قوم کی طرف سے اُن کے مرثیے لکھیں تاکہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے اور اُس میں ہمدردی کی رمق باقی ہے۔

اگرچہ میں اپنے تئیں اس عزت کا مستحق نہیں سمجھتا کہ مجھکو قوم کی زبان سمجھا جائے، لیکن چونکہ میں نے دیکھا کہ مرحومی حکیم محمود خاں کی وفات سے تمام ہندوستان میں عموماً اور دلّی میں خصوصاً ایک غیر معمولی رنج و افسوس پیدا ہوا ہے اور میرے اکثر احباب کو اس حادثہ سے سخت صدمہ پہنچا ہے، اس لئے میں نے چند بند بطور مرثیہ کے ترتیب دئے ہیں اور اس وقت میں اُن کے پڑھنے کی آپ صاحبوں سے اجازت چاہتا ہوں۔

۴۔ تقریر بموقعہ اجلاس اوّل ندوۃ العلماء

(منقول از رپورٹ اجلاس سال اول ندوۃ العلماء)

ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۵-۱۶-۱۷؍ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲-۲۳-۲۴؍ اپریل ۱۸۹۴ء میں جو شہر کانپور میں منعقد ہوا تھا منجملہ دیگر تجاویز کے ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ چونکہ قدیم طریقۂ درس موجودہ زمانے کے لئے کافی نہیں اور بہت کچھ ترمیم طلب ہے، لہٰذا اس میں ایسی معقول اصلاح اور ترمیم کرنی چاہئے کہ وہ زمانہ حال کے موافق اور موجودہ ضروریات کو پورا کرنے والا ہو۔ شرکت اجلاس کی مولانا حالی کو بھی دعوت دی گئی اور بانیان جلسہ کی خواہش پر مولانا نے کانپور جانے اور اس بارہ میں اپنے خیالات علماء کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ مگر بعض خانگی مکروہات کے باعث آپ کا جانا نہ ہو سکا۔ لیکن آپ نے مسئلہ زیر بحث کے متعلق اپنی رائے مفصل طور سے قلمبند کر کے داعیان جلسہ کو بھیجدی تھی جو جلسہ میں سنائی گئی۔

ہم کو اس بات کے سُننے سے نہایت خوشی ہوئی کہ وسطِ ماہ شوال سنہ حال میں ایک مجلس علمائے اسلام کی بتقریب رسم دستار بندی طلبۂ مدرسۂ فیضِ عام بمقام کانپور منعقد ہونے والی ہے جس میں علاوہ رسم دستار بندی کے مدارسِ اسلامیہ کے انتظام اور تعلیم وغیرہ پر بھی گفتگو کیجائے گی اور اس بات میں عام مسلمانوں کی رائے غور اور توجہ سے سنی جائے گی۔ چونکہ راقم بعض خانگی ضرورتوں کی وجہ سے اُن تاریخوں میں وہاں نہیں پہنچ سکتا ہے اس لئے مدارسِ اسلامیہ کے سلسلۂ درس کے متعلق جو کچھ میری رائے ہے اُس کو بذریعہ

تحریر کے پیش کرتا ہوں۔

مدارسِ اسلامیہ جو ہندوستان کے اکثر قصبوں اور شہروں میں عالی ہمت مسلمانوں کی کوشش سے قائم ہوئے ہیں جس طرح اُن کا قائم کرنا نہایت ضروری تھا، اسی طرح یہ بھی نہایت ضرور ہے کہ اُن کو جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید اور اُن کی موجودہ حالت کے زیادہ مطابق بنانے کی کوشش کیجائے۔ اور سب سے مقدم اُن کے سلسلۂ کتب درسیہ کی اصلاح اور ترمیم ہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں ہمارا سلسلۂ درس یکساں نہیں رہا اور آج کل بھی مختلف ملکوں میں مختلف سلسلے مدارس اسلامیہ میں جاری ہیں، ہر ملک اور ہر زمانے کے علماء اپنے ملک اور زمانے کی حالت کے مطابق درس کی کتابیں مقرر کرتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دینیات میں صرف قرآن وحدیث کا درس ہوتا تھا۔ پھر فقہ بھی اُس میں شامل ہوگئی اور رفتہ رفتہ علم اصولِ فقہ اُس پر اضافہ کیا گیا۔ جب تک یونانی فلسفہ مسلمانوں میں شائع نہیں ہوا تھا، اُس وقت تک مدارسِ اسلامیہ میں معقولات کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ پھر جب یونانی فلسفہ درس میں داخل کیا گیا تو ایک مدت تک اس میں علم کلام کے شامل کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہوئی۔ لیکن جب یونانی فلسفہ کی ممارست سے مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہونے لگے اور اسلام میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے تو علم کلام مدوّن کرنے کی ضرورت ہوئی اور وہ بھی سلسلۂ درس میں شامل کیا گیا۔ علیٰ ہذاالقیاس جیسی ضرورتیں پیش آتی گئیں اُنھیں کے موافق سلسلۂ درس میں تغیرّا ورتبدل اور کمی بیشی ہوتی رہی۔

ظاہر ہے کہ پچھلے پچاس برس سے مسلمانوں کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے اس کے سوا ملک کی حالت بھی بالکل بدل گئی ہے۔ مذاہب پر نہایت آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کیجاتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ مدارس جو محض دین اسلام کی تقویت کے لئے قائم کئے گئے ہیں، اُن میں بعینہٖ وہی سلسلۂ درس قائم رکھنا جو قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اسلام

کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔ پس ہمارے علماء کو چاہئیے کہ بمشورہ و صلاح ہمدگر مدارسِ اسلامیہ کے سلسلۂ درس پر غور کرکے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے موافق اس کو از سر نو مرتّب کریں۔

نہایت خوشی کی بات ہو کہ بعض اسلامی مدارس کے مہتموں کو جیسا کہ سنا گیا ہے کتب درسیہ کے معمولی سلسلے میں کچھ ترمیم یا تبدیلی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ مگر میری رائے میں کوئی مفید تبدیلی یا ترمیم اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جبتک کہ ہندوستان کے تمام یا اکثر مدارسِ اسلامیہ اس بات پر متفق نہ ہو جائیں کہ کتبِ درسیہ میں جو تبدیلی یا کمی بیشی کیجائے گی اُسی کے موافق تمام مدارس میں درس جاری کیا جائے گا کیونکہ معمولی سلسلے کی کل کتابیں ہر جگہ بآسانی اور بہ کفایت ملجاتی ہیں اور اگر یہ سلسلہ بدلا گیا تو ممکن ہے کہ ایسی نئی کتابیں درس میں داخل کیجائیں جو ہندوستان میں بہم نہ پہنچیں بلکہ مصر یا بیروت وغیرہ سے منگوائی جائیں۔ یا بڑی بڑی کتابوں میں سے کچھ کچھ مفید ابواب و مضامین انتخاب کرنے پڑیں اور اُن مجموعوں کو بطور کتاب کے علیحدہ چھپوانا پڑے۔ پس تا وقتیکہ تمام یا اکثر مدارسِ اسلامیہ ایک سلسلۂ درس پر اتفاق نہ کرلیں تب تک نئی کتبِ درسیہ کا مہیا ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ اہل مطابع صرف ایک دو مدرسے کے خرچ کے لئے نئی کتابیں جن کی ملک میں عام خریداری نہ ہو نہیں چھاپ سکتے اور نہ کسی مدرسہ کے مہتمم چھپوا سکتے ہیں۔

اب میں معمولی سلسلۂ درس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتا ہوں۔ اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ معمولی سلسلہ کتبِ درسیہ کا سراسر مناسب اور مفید ہے اور اس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں ہے تو بھی میرے نزدیک ضرور ہے کہ کبھی کبھی اس میں کچھ پرانی کتابیں درس سے خارج اور اُن کی جگہ نئی کتابیں درس میں داخل ہوتی رہا کریں۔ اس سے دو فائدے متصور ہیں۔ ایک یہ کہ ان متواتر تبدیلیوں سے اسلام کے بڑے بڑے نامور اور جلیل القدر مصنفوں کی کتابیں قوم میں شائع ہوتی رہیں گی اور اُن کا نام زندہ ہوتا رہے گا

اول تو زمانے کے انقلاب سے مسلمانوں کے کتب خانے برباد ہوگئے جو شہر مسلمانوں کے دار العلم تھے اُن میں ایک بھی قدیم کتب خانہ باقی نہیں رہا اور اگر بالفرض وہ سب کتب خانے قائم بھی رہتے یا اب ویسے ہی کتب خانے پھر قائم ہوجائیں تو بھی قدیم مصنفوں کا نام صرف کتب خانوں سے زندہ نہیں ہوتا بلکہ اُن کی تصنیفات کے درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے سے زندہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو علوم و فنون ہمارے سلسلۂ درس میں بالکل داخل نہ تھے اُن کی مستند کتابیں ہندوستان میں بہت کم پہنچیں۔ زیادہ تر وہی کتابیں شائع ہوئیں جو سلسلۂ درس میں شامل ہوگئی ھیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے علما جو مدارسِ اسلامیہ میں درس دیتے ہیں وہ معمولی کتابیں پڑھاتے پڑھاتے اُکتا جاتے ہیں اور اُن کو درس و تدریس کے مشغلے میں سلسلۂ درس کے علاوہ اور کتابیں مطالعہ کرنے کا موقع ملنا دشوار ہوتا ہے۔ اس ترمیم اور تبدیلی سے اُن کو ہمیشہ نئی نئی کتابیں دیکھنے کا موقع ملے گا اور اُن کے علم و فضل کو نہایت ترقی ہوگی۔

درسی کتابیں جیسا کہ سب اہل علم جانتے ہیں اس لئے ہرگز نہیں مقرر کیجاتیں کہ وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہوتی ہیں اور اُن کے پڑھنے کے بعد اور کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس لئے مقرر کیجاتی ہیں کہ اُن کے پڑھ لینے سے طالب علم کو ہر علم کے ساتھ فی الجملہ مناسبت اور اُس کی طبیعت میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہوجائے جس کے سبب سے وہ ہر علم کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب بغیر اُستاد کی اعانت کے سمجھ سکے۔

ہمارے ہاں جتنے طلبہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں اگر تحصیل کے بعد اُن پر افکارِ دنیوی غالب نہ آئے اور اُن کو کتب بینی کا شوق باقی رہا تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلبہ کی تعلیم اور تدریس میں مشغول ہوجاتے ہیں اور اسی کو علمی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کو درسی کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کے دیکھنے کا شوق بھی ہوتا ہے تو درس و تدریس کے مشاغل میں ان کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ کسی نئی کتاب کا مطالعہ کرسکیں۔ پس سوا اس کے کہ درسی

کتابیں ان کو خوب ازبر ہو جاتی ہیں اور اُن کے تمام مالہ، و ماعلیہ پر عبور ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی نئی اطلاعیں جو آج کل کے جدید تراجم اور مفید تصنیفات میں موجود ہیں ان کو حاصل نہیں ہوتیں ہر علم اور ہر فن میں اُن کو صرف انھیں چند مصنفوں کی رائیں معلوم ہوتی ہیں جن کی کتابیں سلسلۂ درس میں قدیم سے چلی آتی ہیں۔ گویا ایک دریائے زخّار میں سے چند قطروں پر قانع ہو جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس حالت سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں، بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ کا انجام یہی ہوتا ہے. جبکہ یہ حال ہے تو سلسلۂ درس کا کبھی کبھی تبدیل ہونا خاص کر مدرسین کے حق میں نہایت مفید ہوگا، اور اُن کو نئی باتوں، نئے تجربوں، نئی رایوں اور نئی حالتوں پر اطلاع یابی کا موقع ملے گا۔

جو کچھ کہ اوپر بیان کیا گیا یہ تو اُس صورت میں ہے کہ معمولی سلسلۂ درس سراسر مناسب اور مفید ہو۔ پس درصورتیکہ سلسلۂ مذکور کا ایسا حال نہ ہو وہ بالضرور ترمیم اور اصلاح کا محتاج ہوگا۔ میرے نزدیک موجودہ سلسلۂ درس نہایت نامکمل اور غیر مفید ہے۔ میں اس وقت وہ تمام باتیں پیش کرنی نہیں چاہتا جو اصلاح طلب ہیں۔ چند باتیں اس موقع پر عرض کرتا ہوں۔ اگر اُن پر غور اور توجہ کی گئی تو اور مراتب بھی کسی دوسرے موقع پر عرض کئے جائیں گے۔

سب سے بڑا قصور ہمارے طریقۂ درس و تدریس میں یہ ہے کہ صرف و نحو کے ساتھ عربی زبان کے بولنے اور لکھنے کی مشق نہیں کرائی جاتی۔ یہ بعینہٖ ایسی بات ہے کہ معمار اپنے شاگردوں کو معماری کے قاعدے زبانی یاد کرائے اور اُن سے کبھی تعمیر کا کام نہ لے۔ یا باورچی کھانا پکانے کی ترکیبیں زبانی یاد کر لے اور کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہ پکائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ جو معقول اور منقول کی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی درسی کتابیں نہایت عمدگی سے پڑھا سکتے ہیں، وہ عربی زبان کے بولنے اور عربی عبارت کے انشا کرنے سے بالکل عاجز ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اُن کو ابتدا سے لکھنے

کی عادت نہیں ڈالی جاتی اس واسطے وہ جس طرح عربی عبارت کے انشا پر قادر نہیں ہوتے اُسی طرح فارسی بلکہ اُردو لکھنے پر بھی جیسا کہ چاہئے قدرت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو طلبہ ہر سال اسلامی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اُن میں کوئی مصنف یا مؤلف یا مترجم پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری قوم میں جس قدر لائق مدرسوں کی ضرورت ہے اُس سے زائد لائق مصنفوں کی ضرورت ہے۔ عربی سے اُردو میں ترجمہ کرنا ایک عربی داں فاضل کا سب سے زیادہ سہل اور آسان کام معلوم ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ ایسا سہل کام بھی اُن سے سرانجام نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید کا کوئی ترجمہ آج ایسا موجود نہیں ہے جس سے اُس کا مطلب صاف صاف ہر شخص کی سمجھ میں آسکے۔ صرف ایک ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو اُس وقت کیا گیا تھا جبکہ اُردو زبان نہایت ابتدائی حالت میں تھی۔ اُس وقت کے سیکڑوں محاورے اور الفاظ متروک ہوگئے ہیں اور اس لئے اب وہ ترجمہ اکثر مقام سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر فارغ التحصیل فاضلوں میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو اس ضروری کام کو سرانجام کرے اور قرآن مجید کا عام فہم اور خاص پسند ترجمہ کرکے مسلمانوں میں شائع کرے۔ یورپ میں کم سے کم بیس ترجمے قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں اب تک ہو چکے ہیں اور ہمیشہ پانچ چار برس کے بعد ایک نیا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔

عیسائی قومیں تو قرآنِ مجید کی طرف اس قدر متوجہ ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ ایک ترجمہ جو اب سے سو برس پہلے ہوا تھا وہی آج تک چلا آتا ہے۔ اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ ہمارے اسلامی مدرسوں میں تصنیف اور تالیف اور ترجمہ کرنے کی لیاقت طالب علموں میں نہیں پیدا کیجاتی۔

پس میرے نزدیک ایک یہ ضروری بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے عربی جملوں اور فقروں کے عرب عرباء کے کلام سے انتخاب کرکے بنائے جائیں جو ابتدائے

تعلیم سے صرف ونحو کے ساتھ پڑھائے جایا کریں۔ اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق طلبہ کو اول ہی سے شروع کرائی جائے تاکہ صرف ونحو کے قواعد بھی اُن کے دلوں پر نقش ہوں اور عربی زبان میں گفتگو کرنے اور عربی عبارت لکھنے کا ملکہ بھی اُن میں پیدا ہو۔ اور جب تک کتبِ درسیہ کا سلسلہ ختم نہ ہو ہر درجے میں اُس درجے کی حیثیت کے موافق ادب کی کتابوں کا برابر درس جاری رہے چونکہ اس قسم کی کتابیں اور رسالے ہمارے معمولی سلسلۂ درس میں بالکل موجود نہیں ہیں اس واسطے ضرور ہے کہ ایسی کتابیں عربِ عربا رکے کلام سے انتخاب کرکے چند علمار کے مشورے اور اتفاق سے ہر درجے کے موافق بنوائی جائیں۔

ابتک ہمارے ہاں ادب کی تعلیم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب طالب علم منتہی ہونے کے قریب پہنچتا ہے اُس وقت بعض اُستاد اس کو دفعتہً ادب کی نہایت مُغلق اور مشکل کتابیں جیسے متنبی، حماسہ، سبعۂ معلقہ، مقاماتِ حریری وغیرہ پڑھانا شروع کر دیتے ہیں مگر لکھنے کی اب بھی مشق نہیں کرائی جاتی۔ چونکہ طالب علم ابتدا سے عربیت سے اجنبی ہوتے ہیں جب دفعتہً ایک غریب وغیر مانوس نظم یا نثر اُن کے سامنے آتی ہے تو بعض اوقات ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یا تو یہ عربی زبان نہیں اور یا جس زبان میں ہم نے ابتک کتابیں پڑھی ہیں وہ عربی زبان نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ انکو ان عربی کتابوں سے کوئی معتدبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اس فن سے ایسی ہی مناسبت ہوئی تو اس کو صرف اُس وقت فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اُن کتابوں کو اُسی طرح جس طرح کہ استاد نے اُس کو پڑھایا ہے اوروں کو پڑھانے کے قابل ہوجاتا ہے مگر انشا کرنے پر اُس کو کچھ قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ (الاّ ماشاء اللہ)

ادب کی تعلیم کا ایک نہایت جلیل القدر فائدہ یہ ہے کہ جس قدر ادب سے زیادہ مناسبت پیدا ہوگی اُسی قدر قرآن وحدیث کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ اور نظمِ قرآن کی عظمت اور جلالتِ شان نہ محض حسنِ عقیدت سے بلکہ اذعانِ قلب اور جزم ویقین کے ساتھ دل میں متمکن ہوگی اور قرآن کے وجوہِ اعجاز بیان کرنے پر قدرت حاصل ہوگی۔

دوسری بات جس سے اسلامی مدرسوں میں ابتک ابتدائی تعلیم کے متعلق غفلت کی گئی یہ ہے کہ فارسی یا اُردو کو سہل یا ذلیل سمجھ کر اُن کی طرف مطلق اعتنا نہیں کیا گیا۔ بعض مدارس میں صرف اس قدر انتظام ہے کہ جو طالب علم عربی پڑھنا نہیں چاہتے اُن کے لئے ایک آدھ مدرس فارسی سکھانے کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ مگر جو طلبہ عربی زبان میں تحصیل کرتے ہیں اُن کو جہاں تک کہ میں واقف ہوں فارسی اور اردو سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بڑی غلطی ہے۔ فارسی زبان کی اگر تکمیل نہ کرائی جائے تو کم سے کم فارسی کی ادنیٰ اور اوسط درجہ کی کتابیں ضرور سلسلۂ درس میں داخل کرنی چاہئیں۔ اور اُردو زبان میں اگر اور کچھ نہیں تو اس کی انشا اور املا کی ضرور مشق کرانی چاہئیے۔

فارسی زبان کی تعلیم کو میں صرف اسی لئے ضروری نہیں کہتا کہ اُس سے اُردو زبان کی تکمیل میں مدد ملتی ہے بلکہ اس لئے بھی اس کی ضرورت ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بزرگوں کی نشانی ہے اور اس لئے اس کو قائم رکھنا اور اُس سے مناسبت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کے سوا ہماری اکثر مذہبی، تاریخی، اخلاقی اور علمی کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ اس لئے بھی ہمارے فضلا کو مناسب نہیں ہے کہ اُس سے بالکل اجنبی اور ناآشنا رہیں۔

یہ خیال کرنا کہ عربی زبان سیکھنے سے فارسی اور اُردو دونوں پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے صحیح نہیں ہے۔ البتہ اگر انشا کرنے کی پوری پوری مشق طلبہ کو کرائی جائے تو ممکن ہے کہ اُن کو اُردو لکھنے میں کسی قدر مدد ملے۔ لیکن اُردو انشا پردازی میں فاضلانہ لیاقت جس کی کہ ضرورت ہے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ رہی فارسی، سو وہ خود ایک علیحدہ اور مستقل زبان ہے اور ہماری مادری زبان بھی مثل اُردو کے نہیں ہے، وہ عربی سیکھنے سے کیونکر آسکتی ہے۔ اُردو زبان جس میں ہزاروں لفظ ہندی بھاشا کے ہیں، جب اُن کے جاننے سے ہمکو بھاشا نہیں آتی تو عربی جاننے سے فارسی (صرف اس وجہ سے کہ اُس

میں بہت سے عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں) کیونکر آسکتی ہے۔

تیسرا امر قابل غور یہ ہے کہ ہمارا معمولی سلسلۂ درس تاریخ اور جغرافیہ سے بالکل معرّا ہے۔ حالانکہ تاریخ اور جغرافیہ اُن فنون میں سے ہیں جن کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے اول مسلمانوں نے ترقی دی ہے اور اپنے زمانے کے موافق اُن کو کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ تاریخ کے درس میں داخل نہ ہونے سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو فن تاریخ سے بالکل مناسبت نہیں رہی۔ یہاں بے علموں اور ان پڑھ آدمیوں کا ذکر نہیں ہی۔ خود ہمارے اکثر علماء و فضلا اسلام کے اُن تمام مہتم بالشان واقعات سے بالکل بے خبر ہیں جن کو آج تک مغربی قومیں حیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ قطع نظر مسلمانوں کی ملکی فتوحات اور علمی ترقیات کے جو خلافتِ راشدہ میں یا اُس کے بعد ظہور میں آئیں، خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانِ برکت نشان کے حالات سے بہت ہی کم اطلاع رکھتے ہیں۔ علم انساب اور علم رجال صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، جو قومیں آج اپنے تئیں تمام علوم وفنون میں ساری دنیا سے افضل اور برتر سمجھتی ہیں وہ علانیہ اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ ہماری تمام علمی وعملی ترقیات کا ماخذ مسلمانوں کے علوم وفنون تھے، مگر ہم کو مطلق خبر نہیں کہ ہم کیا چیز تھے اور ہمارے بزرگوں نے علم وحکمت کو کس درجہ تک پہنچایا تھا۔ جغرافیہ میں مسلمانوں کی تحقیقات کو آج تک غیر قومیں نہایت عزت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ جغرافیہ میں اُن کی بے مثل تصنیفات اس قابل ہیں کہ اُن پر فخر کر سکتے ہیں، اور یورپ کی قومیں ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھپواتی اور شائع کرتی ہیں۔ مگر ہمارے اسلامی مدرسوں میں ان کا نام تک کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے علم ادب میں، حدیث میں، قرآن میں ہزاروں نام امصار و قریٰ و اماکن و مواضع کے آتے ہیں مگر طالب علموں کو سوا اس کے کہ کسی شہر یا مقام کا نام ہے۔ اُن کی نسبت اور کچھ نہیں بتایا جاتا۔ حالانکہ بہت سے مقامات احادیث وغیرہ میں ایسے آجاتے ہیں کہ جب تک اُن کا محل اور موقع اور مفصل حال معلوم نہ ہو عبارت کا مطلب ہرگز ذہن نشین نہیں

ہوسکتا۔ بہت سے مقامات قرآن، انجیل اور توریت میں ایسے ہیں کہ جب تک اُن کا موقع اور محل معیّن نہ کیا جائے تب تک مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح جغرافیہ اور نیز تاریخ کے جاننے سے اور بے شمار فائدے متصوّر ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہمارے علما نے ظاہراً سلسلۂ درس کے مقرر کرنے میں اس بات کا بہت لحاظ رکھا تھا کہ جو فن نہایت آسان ہیں اور جن کو مستعد طالب العلم اپنی قوت مطالعہ سے نکال سکتے ہیں، اُن کو سلسلۂ درس میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور کچھ عجب نہیں کہ تاریخ اور جغرافیہ سے بھی اسی بنا پر قطع نظر کی گئی ہو لیکن فی الواقع یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ اول تو آسان سے آسان مضمون جب اُس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تو نہایت مشکل مضمون ہوجاتا ہے اور مشکل سے مشکل مضمون پر جب زیادہ غور اور توجہ کیجاتی ہے تو آسان ہوجاتا ہے۔ گویا ذیل کے مشہور شعر میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مشکل ز توجّہِ تو آساں　　　آساں ز تغافلِ تو مشکل

لغت کی کتاب سے لغت نکالنا طالب العلم کا سب سے زیادہ آسان کام ہے مگر ہمارے اکثر طلبہ عدم ممارست کے سبب صُراح و قاموس وغیرہ سے لغت بہت کم نکال سکتے ہیں۔ حساب کے ابتدائی قاعدوں کے سوالات انگریزی مدرسوں کے مبتدی نہایت آسانی سے نکال دیتے ہیں اور ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلبہ ان کا منہ تکتے رہجاتے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کو اگر فرض کرلیا جائے تو وہ فی الواقع نہایت آسان فن ہیں تو بھی اُن کی طرف سے بے اعتنائی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علما کو تاریخ اور جغرافیہ سے بالکل مناسبت نہیں رہی۔

دوسرے تاریخ کو یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ نہایت آسان فن ہے۔ بیشک مسلمانوں نے جب اول ہی اول تاریخ لکھنی شروع کی تھی اُس وقت وہ نہایت ابتدائی حالت میں

تھی اور اس لئے نہایت آسان معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب وہ ایسا دقیق فن ہوگیا ہے کہ تاریخ اور فلسفہ دونوں ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود بعض مسلمان عالموں کی ایسی تاریخی تحقیقاتیں موجود ہیں جو کسی طرح فلسفہ سے کم رتبہ نہیں رکھتیں۔ منطق کے اصول انسان کی معمولی بول چال سے استنباط کئے گئے ہیں، گویا منطق کی ابتدائی حالت انسان کی معمولی بول چال تھی۔ لیکن اب وہ نظر اور فکر کے عمدہ نتائج کا ایک نہایت عمیق اور دقیق فن سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح تاریخ ابتدائی حالت میں کیسی ہی آسان ہو لیکن اب وہ فلسفہ کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ جغرافیہ کا حال بھی تاریخ ہی کے قریب قریب ہے۔ مسلمانوں نے صرف ملکی جغرافیہ لکھا تھا اور وہ فی الواقع نہایت آسان تھا لیکن اب جغرافیہ میں بعض قسمیں ایسی اضافہ ہوئی ہیں جو فلسفے اور حکمت میں داخل سمجھی جاتی ہیں۔

بہرحال میرے نزدیک کم سے کم ابتدائی جماعتوں کے لئے کسی قدر عربی جغرافیوں کا انتخاب اور کل جماعتوں کے لئے اُن کی استعداد اور لیاقت کے موافق عربی تاریخوں کے انتخابات بھی سلسلۂ درس میں ضرور اضافہ کرنے چاہئیں۔

تیسری بات جو سب سے زیادہ توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ریاضی کو ہمارے سلسلۂ درس میں بہت ہی کم حصہ دیا گیا ہے۔ جبر و مقابلہ کو مسلمانوں کے ساتھ وہ خصوصیت ہے کہ بعضوں نے اُس کو خاص مسلمانوں ہی کی ایجاد قرار دیا ہے۔ ہندسہ جو آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے وہ بالاتفاق تحریر اقلیدس کے اُس ترجمہ کی بدولت پھیلا ہے جو محقق طوسی نے عربی زبان میں کیا تھا۔ اقلیدس کی یونانی تحریر دنیا سے مفقود ہو گئی تھی۔ صرف محقق کا ترجمہ باقی تھا۔ اول اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور پھر رفتہ رفتہ تمام یورپ کی زبانوں میں لکھا گیا۔ ہیئت میں مسلمانوں کی ترقی کو تمام یورپ نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ستاروں کے بے شمار عربی نام آج تک یورپ کی زبانوں میں موجود ہیں۔ علم مناظر اور مرایا میں جو نہایت مہتم بالشان مسئلے مسلمانوں نے حل کئے تھے اُن میں سے ایک وہ تھا جس کی بنیاد پر زمانہ حال میں عکسی

تصویر کا حیرت انگیز فن ایجاد ہوا۔ جرِّثقیل میں جو آج کل بے انتہا ترقی ہوئی ہے اُس کے بڑے بڑے اصول مسلمانوں ہی کے قائم کیے ہوئے ہیں۔ غرضکہ ریاضی کی تمام فروع میں مسلمانوں نے اپنے زمانہ کے موافق انتہا درجہ کی ترقی کی تھی۔ باوجود اس کے ہم نے ریاضی سے مطلق سروکار نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ ریاضی سے مسلمانوں کی نامناسبت اس زمانے میں ضرب المثل ہوگئی ہے۔ جہاں تک کہ مجھکو معلوم ہے اکثر اسلامی مدارس میں تو ریاضی کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھائی جاتی۔ حساب، ہندسہ، جبر و مقابلہ، ہیئت علم مثلث، مناظر و مرایا، غرضکہ کوئی فرع سلسلۂ درس میں داخل نہیں ہو مگر سنا جاتا ہو کہ بعض مدارس میں صرف "خلاصۃ الحساب" حساب میں "تشریح الافلاک" اور "شرح چغمینی" ہیئت میں۔ اور کہیں کہیں چند مقالے تحریر اقلیدس کے ہندسے میں پڑھائے جاتے ہیں۔

جو لوگ مدارس اسلامیہ کو ترقی دینا اور مفید بنانا چاہتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سلسلۂ درس میں ریاضی کو جو نہایت ضروری فروع ہیں اُن کی مفید کتابیں علماء کے مشورہ سے داخل کریں اور ہیئت جدید کی کتابیں جو غالباً مصر میں ضرور لکھی اور چھاپی گئی ہوں گی، اگر بہم پہنچیں تو اُن کو بھی وہاں سے طلب کر کے درس میں شامل کریں تاکہ دونوں ہیئتوں کے مقابلہ کرنے کا موقع ملے اور اُن میں سے جو ہیئت غلط ثابت ہو اُس کو ترک کریں اور جو ہیئت صحیح ہو اُس پر اپنے علم کی بنیاد رکھیں۔

ہیئت جدید کو یہ سمجھ کر کہ وہ نصوص قرآنی کے خلاف ہے ترک کرنا اور اُس سے دین میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ کرنا گویا اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ دین اسلام اُس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا۔ جو لوگ دین اسلام کو دین برحق اور خدا کا بھیجا ہوا دین سمجھتے ہیں اُن کا یہ اعتقاد ہونا چاہئے کہ اگر ہیئت جدید سچی ہے تو یقیناً وہ اصول اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ اصول اسلام کے خلاف ہی تو یقیناً جھوٹی

ہے اور ہم ضرور اُس کی غلطی اور جھوٹ ثابت کرسکیں گے۔ لیکن اس بات کے دریافت کرنے کے لئے کہ وہ غلط ہے یا صحیح یا اصول اسلام کے خلاف ہے یا نہیں، ضرور ہے کہ اول اُس کا علم حاصل کیا جائے۔ حکمت یونانیہ جو صدہا سال سے ہمارے ہاں درس میں داخل چلی آتی ہے اُس میں بہت سے مسئلے ابتک ایسے موجود ہیں جو عقائد اہلِ اسلام کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے اُس کو درس میں داخل رکھا گیا ہے۔ کیونکہ جب وہ مسائل اور اُن کے جوابات جو ہمارے علمائے متکلمین نے دئے ہیں، ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے ہیں تو اُن مسائل کی غلطی طلبہ کے خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہیئت جدید کو بھی درس میں داخل کرنا چاہئے، تاکہ اگر وہ فی الواقع اصول اسلام کے خلاف ہو تو ہمارے علماء کو اُس کے رد کرنے کا موقع ملے۔

یہ چند باتیں جو اوپر لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے سے یہ غرض نہیں کہ خواہ نخواہ ان کے موافق عمل درآمد کیا جائے بلکہ یہ غرض ہے کہ اُن کو غور سے سنا جائے اور اگر کوئی بات تسلیم کرنے کے قابل ہو تو اُس کے موافق یا اُس میں کمی بیشی کرنے کے بعد عمل درآمد کیا جائے۔

۵۔ علیگڈھ کالج میں ایک تقریر

(قلمی مسودہ سے نقل کی گئی)

یہ تقریر مولانا نے طلبائے مدرستہ العلوم مسلمانان علیگڈھ کے سامنے اس موضوع پر فرمائی تھی کہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد طلبہ کو کیا کرنا چاہئے اور اپنی معاش کس طرح حاصل کرنی چاہئے۔

صاحبو! میں نے آپ کو اس ہال میں جمع ہونے کی آج اس لئے تکلیف دی ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد فکر معاش کا دشوار گذار مرحلہ جو آپ کو درپیش ہے اس کے متعلق آپ کو چند مشورے ایسے دوں جن کو میں اپنے نزدیک آپ کے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔

اے میرے عزیزو! اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ ہماری قوم میں تعلیم کا خیال روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے اور مذہبی خیالات جو تعلیم کے مانع سمجھے جاتے تھے ان کی مزاحمت کم ہوتی جاتی ہے مگر میری رائے جس کو شاید تم بھی تسلیم کروگے اب تک اس باب میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تعلیم کو بطوع و رغبت قبول نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح اضطرار کی حالت میں مکروہ اور حرام چیزیں بھی حلال سمجھ لی جاتی ہیں اسی طرح مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کو بہ مجبوری گوارا کر لیا ہے۔ کیونکہ رئیس اور دولتمند مسلمان جو فکر معاش سے فارغ البال ہیں جب تک ان کو اپنی اولاد کی تعلیم کا خیال اور شوق پیدا نہ ہو تب تک یہ ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا کہ مسلمان بطوع و رغبت تعلیم کی طرف مائل ہو گئے ہیں بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ جن کو معاش کا کچھ سہارا نہیں ہے یا جو اپنے بعد اولاد کے لئے کوئی جائداد یا آمدنی چھوڑنے والے نہیں ہیں، وہ انگریزی تعلیم کو محض ایک ذریعہ معاش یا نوکری کا سمجھ کر اولاد کو بہ کراہت و مجبوری تعلیم دلواتے ہیں۔

پس اگر میرا یہ خیال صحیح ہو اور فی الواقع تعلیم کے خواہاں حالتِ موجودہ میں صرف وہی لوگ ہیں جو معاش کی طرف سے فارغ البال نہیں تو آپ میں سے ہر شخص کو تعلیم ختم کرنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کر لینا ضرور ہے کہ ہم تعلیم ختم کرنے کے بعد فلاں پیشہ اختیار کریں گے یا فلاں ذریعۂ معاش بہم پہنچائیں گے تاکہ ابھی سے آہستہ آہستہ اس پیشہ کے لئے تیار ہونے اور اس کی لیاقت بہم پہنچانے کا موقع ملے اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد اندھا دھند دائیں بائیں ہاتھ مارنے کی ضرورت نہ پڑے، بلکہ جو امر پہلے سے ٹھان لیا گیا ہو اس کو مضبوط پکڑ لیا جائے۔

اگرچہ قوم کو تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور اگر خدا کو منظور ہے تو وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے کہ تمھیں میں سے بہت سے ایسے روشن ضمیر پیدا ہوں گے جو اپنے علم کے ذریعہ سے ملک اور قوم میں روشنی پھیلائیں گے اور علم کو علم ہی کے واسطے پڑھیں گے، مگر حالت موجودہ میں تم سے یہ امید رکھنی قبل از وقت ہوگی۔ بالفعل تمھاری تعلیم کا اشرف و اعلیٰ مقصد یہ ہونا چاہئے کہ تم تعلیم کے ذریعہ سے معاش پیدا کرو اور جہاں تک ہو جائز وسائل سے روپیہ پیدا کر کے اپنے اپنے خاندان کو تقویت دو۔ اور جس امید پر تمھارے بزرگوں نے تمھاری تعلیم کے اخراجات اپنے حوصلہ اور بساط سے بڑھ کر برداشت کئے ہیں، ان کی اس امید کو پورا کر کے دکھاؤ۔

مگر اے عزیزو! تمھاری راہ میں بہت سی رکاوٹیں ایسی نظر آتی ہیں کہ جب تک وہ دور نہ کی جائیں گی، اُس وقت تک تمھارا منزل مقصود تک پہنچنا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ تمھارے آبا و اجداد نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمانوں کی سلطنت قائم تھی اور شاہی ملازمت میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا حصہ تھا، تمام فوجی اور ملکی خدمات کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا تھا۔ پس ان کے لئے وجہ معاش کا کوئی ذریعہ نوکری سے زیادہ آسان اور سہل الوصول نہ تھا۔ مگر تم جانتے ہو کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ اب وہ شاہی ملازمت جس میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ حصہ تھا اُس کے مستحق اُن انگلستان کے چار کروڑ باشندے

اور اُن کے بعد ہندوستان کے پچیس کروڑ باشندے ہیں۔ اب کسی طرح ممکن نہیں کہ چھ کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہیں، وہ اب بھی اپنے آباواجداد کی طرح معاش کو نوکری میں منحصر سمجھیں۔ اور نوکری کے سوا معاش کے اور ذریعوں سے اسی طرح الگ تھلگ رہیں جس طرح اُن کے آباواجداد رہتے تھے۔ گورنمنٹ میں نہ یہ طاقت ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام رعایا پر ترجیح دے کر کل خدمات و مناصب انھیں کے حوالے کر دے۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے کل مسلمان یا کم سے کم تعلیم یافتہ مسلمان جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے تمام پیشوں سے قطع نظر کر کے صرف سرکاری نوکری پر قناعت کر بیٹھیں۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال گذرے کہ جس قوم میں پشتہاپشت سے برابر نوکری پیشہ ہوتے چلے آئے ہیں اور جن کے بڑوں نے کبھی تجارت یا زراعت یا صنعت و دستکاری کے ذریعہ سے معاش پیدا نہیں کی وہ نوکری کے سوا کسی اور ذریعہ سے کیونکر معاش پیدا کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ جس قوم یا خاندان کی چند پشتیں کسی خاص پیشہ میں گذر جاتی ہیں اس کی آئندہ نسلوں میں اس خاص پیشہ کے سوا کسی دوسرے پیشہ کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔ تجارت پیشہ قوم کی اولاد ماں کے پیٹ سے تاجر پیدا ہوتی ہے اور زراعت پیشہ قوم کی نسل میں فطرۃً زراعت کی قابلیت ہوتی ہے۔ اسی طرح جو خاندان کئی پشت سے نوکری پیشہ چلا آتا ہے اس کی اولاد میں نوکری کے سوا کسی چیز کی قابلیت نہیں ہوتی۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں جس طرح تجارت و زراعت وغیرہ کی قابلیت نہیں ہے اسی طرح حالت موجودہ میں وہ نوکری کی قابلیت بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ جس طرح اُن کے بزرگوں نے تجارت و زراعت وغیرہ کے ذریعہ سے کبھی معاش پیدا نہیں کی، اسی طرح کسی فارن گورنمنٹ میں ملازمت کرنے کا بھی ان کو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے عہد میں آسانی سے عہدے

اور منصب پاتے رہے اور اس لئے نہ کبھی ان کو وہ تدبیریں اور کوششیں کرنی پڑیں جن کے بغیر کسی فارن گورنمنٹ میں رسائی ہونی ناممکن ہے اور نہ اپنے تئیں وہ لیاقتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہوئی جو ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ اور تقرب حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ پس جو مشکلات کہ مسلمان نوجوانوں کو تجارت وزراعت اختیار کرنے میں نظر آتی ہیں وہی مشکلات حالتِ موجودہ میں نوکری پر عائد ہوتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے پیشے جو خود ہمارے اختیار میں ہیں ان کو چھوڑ کر ایسا کام اختیار کیا جائے جو ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ گورنمنٹ کے اختیار میں ہے اور جس کا استحقاق پیدا کرنا اور اس کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا خاص کر اس زمانہ میں سخت دشوار ہے۔

شاید میرا کہنا کہ مسلمانوں میں فارن گورنمنٹ کی نوکری کرنے کی لیاقت عام طور پر ایسی جیسی کہ ہندوستان کی دیگر اقوام میں ہے نہیں پائی جاتی، آپ کو ناگوار گذرا ہو گا فی الحقیقۃ یہ کوئی بُرا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان اس قاعدہ کلیہ سے مستثنےٰ نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر مسلمانوں کا ایسا ہی حال ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا۔ اور انصاف یہ ہے کہ اُن کا ایسا ہی حال ہونا چاہیئے تھا مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی تمام قومیں ہزار برس سے غیر قوم کی محکوم چلی آتی تھیں، اس لئے صبر وتحمل فرمانبرداری، زمانہ سازی، فروتنی، رفق ومدارات اور دیگر صفات جن پر ایک محکوم قوم کی کامیابی بلکہ سلامتی اور زندگی منحصر ہے۔ طول عہد کے سبب ان کی قومی خصلتیں بن گئی تھیں اور جو لیاقتیں ایک فارن گورنمنٹ میں رسوخ وتقرب حاصل کرنے کے لئے درکار ہیں اُن کی جبلت میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جو قومیں ان میں روزگار پیشہ تھیں وہ جس طرح فارسی زبان آسانی سے سیکھ لیتی تھیں اسی طرح انگریزی سیکھنے میں کوئی مشکل معلوم نہیں ہوئی اور جس طرح وہ مسلمانوں کے عہد میں تمام دفتروں پر حاوی تھے اسی طرح انگریزوں کے عہد میں تمام دفتر اور آفس ان سے معمور ہو گئے۔

۶۔ تقریر متعلق اصلاح و ترقی مسلمانانِ پانی پت

(قلمی مسودہ سے نقل کی گئی)

یہ تقریر مولانا نے باشندگانِ قصبہ پانی پت کے ایک جلسہ میں اپنے اہل وطن کی معاشرتی اصلاح اور انسداد رسومِ قبیحہ کے متعلق فرمائی تھی۔

جناب چیرمین اور تمام حاضرین جلسہ!

پہلے اس سے کہ اصل مطلب کے متعلق کچھ بیان کیا جائے اوّل حضور ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند کی مادرانہ شفقت اور مہربانی کا جنھوں نے ہندوستان کی بہبودی کے لئے منصف اور خدا ترس حاکم مقرر کئے ہیں اور پھر اپنے صوبہ کے لفٹننٹ گورنر سر ڈینس فٹز پیٹرک کی عنایت کا جو ہماری بہبودی کا خیال ہم سے بہت زیادہ رکھتے ہیں اور خاص کر اپنے ضلع کے نیک دل اور ہر دلعزیز ڈپٹی کمشنر مسٹر آگنیو کا جو صرف ہمارے فائدے کے لئے کرنال سے یہاں تشریف لائے ہیں، شکریہ ادا کرنا ضرور ہے۔

جس کام کے لئے ہم سب لوگ آج اس مقام پر جمع ہوئے ہیں وہ ایسا ضروری کام ہے کہ ہم کو بغیر اس کے کہ اپنے حاکموں کو اس کے لئے تکلیف دیتے خود اس کے سرانجام کرنے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ اگرچہ جس قدر قومیں اس قصبہ میں آباد ہیں ہم کو اُن سب کے ساتھ ہمدردی ہے اور ہماری آرزو ہے کہ سب مل جل کر اپنی حالت درست کریں۔ مگر میں اس موقع پر خاص کر چاروں طرفوں کے مسلمان بسوہ داروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے میری مراد انصاری، مخدوم زادے، راجپوت اور پٹھان ہیں اور جن کا حال روز بروز نہایت سقیم ہوتا جاتا ہے۔

چاروں قوموں میں چند مستثنیٰ آدمیوں کے سوا جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں

کوئی شخص آسودہ اور خوش حال نظر نہیں آتا۔ اُن کی حقیت نصف سے زیادہ بیع اور رہن کے ذریعہ سے غیر بسوہ داروں کے پاس منتقل ہو چکی ہے اور جو باقی ہے وہ برابر منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ ناداری اور افلاس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سیکڑوں آدمی اپنی اولاد کو صرف اس وجہ سے تعلیم نہیں دلوا سکتے کہ مدرسہ کی فیس اور کتابوں کی قیمت ادا کرنے کا فی الواقع مقدور نہیں رکھتے۔ چاروں قوموں میں آدمیوں کی تعداد دن بدن گھٹتی جاتی ہے، نسلیں برابر منقطع ہوتی جاتی ہیں۔ پچھلے چالیس پینتالیس برس کے عرصہ میں اکثر خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ بہت سے خاندان چراغِ سحری ہیں، نا اتفاقی اور پھوٹ اور قصے جھگڑے جو ادبار کی نشانیاں ہیں کم و بیش چاروں قوموں میں پھیل رہے ہیں۔ اگر ان تمام خرابیوں کا سبب پوچھا جائے تو ہمارے بھائیوں کے پاس صرف ایک جواب ہے۔ وہ کبھی اپنا قصور نہیں بتاتے بلکہ ہمیشہ خدا کو الزام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی یہی ہے۔ حالانکہ خدا نے جیسا کہ خود قرآن میں فرماتا ہے کسی قوم کو جب تک وہ آپ نہیں بگڑی کبھی نہیں بگاڑا۔ درحقیقت یہ ہماری نالائقی ہے کہ جو خرابیاں خود ہمارے سبب سے ہم پر آ رہی ہیں اُن کو ہم خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اپنے تئیں بے قصور قرار دیتے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور سوچیں کہ ہماری یہ حالت خود بخود ایسی ہوتی چلی جاتی ہے یا ہم اپنے کرتوتوں سے اپنے تئیں آپ برباد کر رہے ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے جو رسمیں آسودگی کے زمانے میں مقرر کی تھیں ہم اُن رسموں کو بے مقدوری اور ناداری کے زمانے میں جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ مونڈن، ختنہ، بسم اللہ، منگنی اور بیاہ وغیرہ میں اپنے بساط سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نقدی یا زیور ہوتا ہے وہ انجام کا خیال بالکل نہیں کرتے اور محض فضول اور بے جا تقریبوں میں سب خرچ کر کے بیٹھ رہتے ہیں۔ جن کے پاس زیور یا نقدی نہیں ہوتی وہ گھر بار بیچ کر یا رہن رکھ کر بڑوں کی ریت پوری کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تجارت ہم نہیں

کرتے، دُکانداری اور صنعت و حرفت کو عیب سمجھتے ہیں، نوکری کرنے کی لیاقت پیدا نہیں کرتے۔ صرف زمین کی آمدنی پر ہم لوگوں کا گذارہ ہے اور اسی پر ہماری عزت و آبرو کا انحصار ہے۔ ایسی عزیز چیز کو ذرا ذراسی فضول اور بیہودہ تقریبوں میں بیع یا رہن کر کے اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ کر دیتے ہیں۔ وہی لوگ جن کو مدرسہ کی فیس دینی سخت دشوار ہے اور اس لئے اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے وہی شادی اور غمی کی بیہودہ رسموں میں گھر بار بیچ کر پانسو ہزار ہزار روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ اولاد کی تعلیم جس سے زیادہ کوئی ضروری کام نہیں ہو سکتا اس کو تو اس بہانے سے ٹال دیتے ہیں کہ تعلیم کا خرچ ہم سے نہیں اُٹھ سکتا اور اُن بیہودہ رسموں میں جن کو نہ عقل جائز رکھتی ہے اور نہ شرع، اپنی روزی کا آسرا فروخت یا رہن کر کے ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔ رسموں کی پابندی نے یہاں تک مجبور کر رکھا ہے کہ صرف شادیوں ہی میں یہ فضولیاں نہیں ہوتیں بلکہ میت میں بھی اسی طرح آنکھیں بند کر کے خرچ کیا جاتا ہے۔ باپ مر گیا ہے، بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے، اُس کی جائداد اور آمدنی بجائے اس کے کہ اُن صغیر سن بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں خرچ ہو یا اُس کے کنبے کے رزق کا سہارا ہو برس روز تک برابر برادری کی مہمانداری میں صرف ہوتی ہے۔ سوئم اور دسویں، بیسویں، چالیسویں، چھ ماہی اور برسی میں سیکڑوں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ بہت سے بھائی عدالت کے جھگڑوں میں اپنا بنا بنایا گھر بگاڑ دیتے ہیں۔ دس دس بیس بیس روپیہ کی حقیت کے واسطے سینکڑوں ہزاروں روپیہ برباد کر دیتے ہیں۔ برادری کی پنچایت کے فیصلوں سے جن میں ایک کوڑی خرچ نہیں ہوتی اور دونوں فریقوں کو کچھ نہ کچھ ملجاتا ہے کبھی راضی نہیں ہوتے۔ اور عدالت میں سیکڑوں ہزاروں خرچ کر کے ہار اور جیت دونوں صورتوں میں تباہ ہو جاتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اسباب ہیں جن سے ہماری حالت

روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے۔ افلاس بڑھتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساری خوبیاں گھٹتی جاتی ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جو ان سب باتوں کو سمجھتے ہیں اور ان تمام رسموں کو لغو اور اپنی تباہی و بربادی کا ایک بہت بڑا ذریعہ جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ رسمیں موقوف ہو جائیں، مگر وہ خود ایک رسم بھی موقوف نہیں کر سکتے۔ ان کو شریعت کی باندھی ہوئی حدیں توڑنی آسان ہیں مگر رسم و رواج کی کوئی قید ان سے نہیں ٹوٹ سکتی۔

بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ لوگ جن رسموں کو اپنے حق میں مضر جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ کسی طرح موقوف ہو جائیں اُن کو خود موقوف نہیں کر سکتے۔ مگر درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ برٹش گورنمنٹ کی حکومت سے پہلے ہندوستان میں ہزاروں برس سے ڈسپاٹک گورنمنٹ یعنی شخصی حکومت چلی آتی تھی جس میں رعیّت کی بھلائی اور بہبودی کا ہر ایک کام بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا۔ رعیت جس طرح ملکی معاملات میں کچھ دخل نہ رکھتی تھی اسی طرح قومی رفاہ اور فلاح کے کاموں سے اس کو کچھ سروکار نہ ہوتا تھا۔ نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تمام ایشیا کی تاریخ میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں دیکھی گئی کہ کسی قوم نے بغیر مداخلت سلطنت کے صرف اتفاق باہمی سے کوئی مدرسہ قائم کیا ہو یا کوئی شفاخانہ جاری کیا ہو یا کوئی سوشل رفارم یعنی طریقِ معاشرت کی اصلاح کی ہو یا کوئی اور کام تمام قوم کی بھلائی کا کیا ہو۔ البتہ خاص خاص اشخاص بڑے بڑے مفید کام کرتے تھے کسی وزیر نے تمام قوم کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کر دیا کسی امیر نے کوئی شفاخانہ جاری کر دیا۔ کسی سردار نے پل بندھوا دیا، کنواں کھدوا دیا، سرائے بنوا دی، اور اسی طرح کے اور مفید کام خاص خاص شخص کرتے رہتے تھے لیکن تمام قوم نے متفق ہو کر کبھی کوئی رفاہ عام کا کام نہیں کیا۔ قوموں کی ہر قسم کی بھلائی یا برائی ہمیشہ سلطنت کے قبضہ میں رہی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے تئیں سلطنت کے ہاتھ میں ایسا سمجھتے رہے جیسا مردہ غسّال کے

قبضہ میں ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ تمام رعایا بے حس وحرکت ہوگئی اور ایکٹوٹی یعنی عملی طاقت اُن میں بالکل مفقود ہوگئی۔ اور یہ خصلت اُن کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آئی۔

اگرچہ ہم برٹش گورنمنٹ کے نہایت شکرگذار ہیں کہ اُس نے ہم کو برخلاف شاہانِ سلف کے ہر طرح کی آزادی دی ہے ہم اپنی ترقی اور اصلاح کی ہر طرح کی تدبیریں عمل میں لا سکتے ہیں جس طرح ہم اپنی تعلیم وتربیت کا سامان بغیر مداخلت گورنمنٹ کے کر سکتے ہیں اسی طرح ہر قسم کی سوشل اصلاحیں بغیر گورنمنٹ کی دست اندازی کے کر سکتے ہیں۔ مگر ایشیائی خودمختاری جو ہزارہا سال سے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ابتدائے آفرینش سے ایک حالت پر چلی آتی تھی اور جس نے ایشیا کی تمام قوموں کو بے حس وحرکت کر دیا تھا، اس کا اثر ابھی تک ہماری رگوں اور پٹھوں میں موجود ہے۔ اس لئے ہم آزادی کی نعمت سے جو گورنمنٹ نے ہم کو بخشی ہو حالت موجودہ میں فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہم خاص اپنی بھلائی کا کوئی کام بغیر گورنمنٹ کی امداد کے نہیں کر سکتے۔ گورنمنٹ نے ستی اور دخترکشی کی رسم خود موقوف کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ہندوستان کا دامن شاید اب تک ان گناہوں سے پاک نہ ہوتا۔ اسی طرح گورنمنٹ نے بیسیوں قانون ہماری صحت کے متعلق، ہمارے رسم ورواج کے متعلق، ہماری اخلاقی اور دماغی تربیت کے متعلق ایسے بنائے ہیں جن سے خاص ہمارے ذاتی فائدے کے سوا گورنمنٹ کی کوئی غرض متعلق نہیں ہو۔ اگر ہے تو صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کی خوبی یہی ہے کہ اس کی رعیت ہر طرح آسودہ اور خوشحال ہو۔

ہم گورنمنٹ کی اس خاص عنایت کا نہایت سچے دل سے اقرار کرتے ہیں اور اُس کے شکرگذار ہیں کہ اُس نے ہماری شادی اور غمی کے اخراجات کے انتظام کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ اور ہمارے ضلع کے نیک دل اور غریب پرور

ڈپٹی کمشنر اسی غرض کے لئے ہمارے قصبہ میں تشریف لائے ہیں۔ مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس قسم کی تحریکیں پہلے بھی ہو چکی ہیں مگر اُن سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ اور اگر میری رائے غلط نہ ہو تو ہرگز امید نہیں کہ اس تحریک سے بھی بغیر سرکاری دباؤ کے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو گا۔

۷۔ تقریر متعلق مجوزہ مسلم یونیورسٹی

(منقول از رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس متعلق اجلاس دوازدہم ۱۸۹۹ء صفحہ ۸۰ تا ۱۰۰)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بارھواں اجلاس جو لاہور میں دسمبر ۱۸۹۹ء میں منعقد ہوا تھا ہمیشہ اس بات کے لئے مشہور رہے گا کہ موجودہ "مسلم یونیورسٹی علیگڈھ" قائم کرنے کی سب سے پہلی تجویز کانفرنس کے اس اجلاس میں پیش کی گئی۔ یہ اجلاس کانفرنس کا نہایت اہم اجلاس تھا۔ اور بڑے بڑے لوگوں نے یونیورسٹی کے قیام اور اجرا کے متعلق اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور جو لوگ کسی وجہ سے شامل اجلاس نہیں ہو سکے انھوں نے خطوط کے ذریعہ اپنی رائیں اس مسئلہ کے متعلق سکرٹری کانفرنس کو لکھ کر بھیجیں۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے مسٹر ماریسن پرنسپل علیگڈھ کالج نے اس مضمون کا ریزولیوشن پیش کیا تھا کہ "اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں کی ایک علٰحدہ یونیورسٹی کا قائم ہونا مستحسن ہے" اس ریزولیوشن کی تائید میں جس قدر تقریریں ہوئیں اور جس قدر تحریرات اور خطوط وغیرہ اس کے متعلق دفتر کانفرنس میں آئے۔ کانفرنس نے وہ سب اسی سنہ میں چھاپ کر شائع کر دیئے تھے۔

نواب محسن الملک نے مولانا حالی کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی اور نہایت آرزو ظاہر کی تھی کہ تشریف لا کر اس مسئلہ کے متعلق اپنی زبان سے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مولانا کا بھی مصمم ارادہ تھا کہ خود لاہور جائیں مگر بیمار ہو جانے کے سبب اُن کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ جب مولانا کے شریک اجلاس ہونے کی کوئی توقع نہ رہی تو ناچار محسن الملک نے نہایت اصرار سے

آپ کی خدمت میں لکھا کہ اب جبکہ آپ کی بذات خود شمولیت کی کوئی امید نہیں رہی تو اپنی تقریر ہی لکھ کر یا لکھوا کر بھیجدیں۔ جس سے آپ کے قیمتی خیالات اس مسئلہ کے متعلق حاضرین معلوم کرلیں چنانچہ یہ وہی تقریر ہے جو مولانا نے لکھ کر نواب محسن الملک کو بھیجی تھی اور محسن الملک نے اُس کو ۳۱ر دسمبر ۱۸۹۹ء کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا تھا۔

صاحبو! یہ ریزولیوشن جس کی تحریک کرنے کی مجھے عزت دی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی ریزولیوشن آج تک کانفرنس کے کسی اجلاس میں پیش نہیں ہوا۔ غالباً آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ سرسید مرحوم نے جب ولایت سے واپس آکر مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی، اُس وقت اُن کا ارادہ بجائے محمڈن کالج کے جو اُنھوں نے قائم کیا درحقیقت ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا۔ چنانچہ جو اسکیم آنریبل سید محمود نے ۱۰ر فروری ۱۸۷۳ء کو کالج فنڈ کمیٹی میں پیش کی تھی، اُس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ اور اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اُس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا گیا تھا۔ مگر گورنمنٹ شمال مغرب نے اس لحاظ سے کہ اس وقت کمیٹی کی ابتدائی حالت تھی اور اُس کی آئندہ کارروائیوں پر کسی طرح اطمینان نہیں ہوسکتا تھا، کمیٹی کو یہ جواب دیا تھا کہ اگر وہ محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اُس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دے گی۔ باوجود اس کے بھی سرسید کا ارادہ مدت تک یہی رہا کہ محمڈن یونیورسٹی قائم کیجائے اور گورنمنٹ کی امداد سے بالکل قطع نظر کیجائے۔ مگر چونکہ بغیر گورنمنٹ کی منظوری کے یونیورسٹی قائم کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا تھا اس لئے اُنھوں نے آخر کار محمڈن کالج قائم کرنے پر قناعت کی۔ مگر ۲۶ برس کے عرصہ میں محمڈن کالج نے توقع سے زیادہ ترقی کی ہے اور گورنمنٹ کی نظر میں بہت

کچھ اعتبار کرلیا ہے۔ اس لئے جیسا کہ تھیوڈور ماریسن اسکوائر نے ایک موقع پر پچھلے دنوں میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو جو اپنی تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینا اور گورنمنٹ کو اس بوجھ سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں، مجوزہ یونیورسٹی قائم کرنے سے مانع آئے گی۔

پس جو ریزولیوشن اس وقت پیش ہوا ہے اگر مسلمانوں کی متفقہ کوشش سے یہ تجویز پوری ہو گئی تو اُن کو ایک ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوگی جو اُن کے بزرگ لیڈر سرسید مرحوم کو باوجود چالیس برس کی لگاتار کوشش کے اپنی زندگی میں حاصل نہیں ہوئی یہاں تک کہ اس تمنا کو اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ اور دنیا پر روشن ہوجائے گا کہ اُس مرحوم نے جو بیج مسلمانوں میں فوقیت کا بویا تھا وہ اکارت نہیں کیا گیا۔

مگر میں اس ریزولیوشن کو صرف اسی وجہ سے ضروری نہیں سمجھتا بلکہ میں زیادہ تر اس سبب سے اُس کو ضروری خیال کرتا ہوں کہ اُس میں محمڈن یونیورسٹی اُس شخص کی یادگار میں قائم کرنی تجویز ہوئی ہے جو چند روز میں ہم کو اس قابل بنا گیا ہے کہ اپنے قومی کالج کو یونیورسٹی بنانے کا حوصلہ ہم میں پیدا ہوا ہے۔

صاحبو! یہ کچھ کم تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ جو قوم بیس پچیس برس پہلے انگریزی تعلیم کو برہمزنِ دین و مذہب خیال کرتی تھی، اُس کی اشاعت کے لئے چندہ دینے کو گناہ و معصیت جانتی تھی اور اُس کے حامیوں کو کافر و ملحد قرار دیتی تھی، اُس قوم میں ایک بارُعب جماعت ایسی پیدا ہو جائے جو انگریزی تعلیم کے لئے یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ پُرانے خیالات اور رخاص کردہ خیالات جو مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، اُن کا بدلنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا پہاڑ کا اپنی جگہ سے مٹ جانا۔ پس وہ کیسی زبردست قوت ہوگی جس نے اس قدر جلد مسلمانوں کے خیالات میں یہ تبدیلی کردی۔

اے زندہ دلان پنجاب! آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ نے آنکھ کھول کر روشنی ہی روشنی دیکھی ہے - اور اس لئے تعصبات کی وہ گھنگھور گھٹا جو دلی سے لکھنؤ تک تمام مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اور بہت کچھ اب تک چھائی ہوئی ہے اُس کا شاید پورا پورا اندازہ آپ نہیں کر سکتے - ہم نے وہ تعصبات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اور اب تک دیکھتے ہیں اور خود ہم نے انھیں تعصبات کے بھونرے میں نشو و نما پائی ہے جو بلا مبالغہ اس آیت کے مضمون کا مصداق تھا اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُہَا فَوْقَ بَعْضٍ - مگر کسی بزرگ کا قول ہے کم نکبۃٍ للہِ فیھا رحمۃ - (یعنی اکثر بدبختیوں میں خدا کی رحمت چھپی ہوئی ہوتی ہے) وہی تاریکی جو ہم پر چھائی ہوئی تھی ہمارے لئے روشنی کا فرشتہ بن گئی - وہی دارالخلافہ جو مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا مرکز اور مذہبی تعصبات کا سرچشمہ تھا، اُس کی خاک سے ایک شخص اٹھا جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا۔ اور آخر وہ فتح نمایاں حاصل کی جس کا ظہور ہم اس وقت اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ جس تعلیم کے نام سے ہم سو سو کوس بھاگتے تھے آج اُسی تعلیم کے لئے یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں - اور جس شخص کو کافر و ملحد کہتے تھے اُس کی شکرگذاری میں یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں۔

صاحبو! یہ انقلاب عظیم جو ہمارے خیالات میں پیدا ہوا ہے اور ہماری تمام آئندہ ترقیات کی جڑ ہے، اس کو سرسری نظر سے نہ دیکھنا چاہئے - ایک لڑکا جو راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے، اُس کے خیالات کی اصلاح میں والدین کی تمام عمر گذر جاتی ہے اور وہ ہرگز راہ پر نہیں آتا - پھر جس شخص نے بیس پچیس برس کے عرصہ میں لاکھوں کے خیالات بدل دئے اور کروڑوں کو چوکنا کر دیا، اُس کو دیکھنا چاہئے کہ اس منزل میں کیا کیا دشواریاں پیش آئی ہوں گی اور کیسے کیسے سخت مرحلے طے کرنے پڑے ہوں گے - وہ کس دل و دماغ کا انسان ہوگا اور اس کی ہمت اور اُس کا استقلال کس درجہ کا ہوگا -

افسوس ہے کہ وقت میں اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ سرسید کی زندگی کے واقعات مختصر طور پر بھی اس جلسہ میں بیان کرسکوں ۔ اور چونکہ اُن کی لائف عنقریب پبلک میں شائع ہونے والی ہے اس لئے میں اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔

لیکن اے صاحبو! اگر آپ مجھکو اجازت دیں تو میں اس موقع پر چند نتائج اُن کی ملکی اور قومی خدمات کے بیان کروں جس سے کسی قدر اس بات کا اندازہ ہوسکے کہ اس مرحوم کی کوششوں سے ہم نے کیا کیا فائدے اٹھائے ہیں اور کہاں تک اُس کی شکرگذاری ہمارے ذمہ واجب ہے۔

صاحبو! اگرچہ ہماری قوم کا میلان ایک عرصہ دراز سے روز بروز پستی کی طرف ہوتا جاتا تھا۔ اُن کی تمام خوبیاں آہستہ آہستہ گھٹتی جاتی تھیں، علم میں، دولت میں، اخلاق میں، درجہ میں وہ اپنی ہموطن قوموں سے گرتے جاتے تھے مگر پستی اور تنزل بہ ظاہر چنداں محسوس نہ ہوتا تھا۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء غدر کی آندھی اُٹھی جس نے اُس ٹمٹماتے چراغ کو بالکل بجھا دیا۔ یکایک مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہوگئی ۔ چند گھرانے جو کسی قدر نام و نمود رکھتے تھے ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئے ۔ اور ہزاروں معرکہ بغاوت میں مارے گئے، اور ہزاروں جانیں دوسروں کے لئے عبرت کا سبق دینے میں کام آئیں۔ ہزاروں اپنا وطن اور شہر و دیار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہوگئے اور جو باقی رہے اُن کا یہ حال تھا کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں ۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں، ہزاروں بچے یتیم ہوگئے، گھر چھن گئے جائدادیں ضبط ہوگئیں، بڑے بڑے عالی خاندان فقیر ہوکر تکیوں میں جا بیٹھے۔ بہت سے بھیک مانگتے پھرتے تھے، باورچی گری اور خدمت گاری کرتے تھے مشکیں اٹھاتے تھے، گاڑیاں ہانکتے تھے۔

خیر یہ مصیبتیں تو ہمیشہ تھیں، کہ ہمیشہ لڑائی کے ہنگاموں کے بعد اہل ملک کو

بھٹکتی پڑتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ جہاں تک نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے اُن کو مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے زمانہ مستقبل کو زیادہ خوفناک پاتے تھے۔ اُن کو ہندوستان میں رہنا ایسا ہی مشکل ہو گیا تھا جیسے دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔ مسلمان عموماً بہ حیثیتِ قومی و مذہبی انگلش گورنمنٹ کے مخالف سمجھ لئے گئے تھے، حکام کی نظر میں ان کا اعتبار ہی نہیں جاتا رہا تھا بلکہ وہ سلطنت کے حق میں اور ملک کے امن اور انتظام کے حق میں ایک خطرناک فرقہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی بدبختی ہندوستان کی اور قوموں کے لئے پناہ بن گئی تھی اور بقول سرسید کے وہ ہر ایک جرم اور ہر ایک الزام کا بوجھ اس بدنام قوم کے سر پر دھرا جاتا تھا۔ غرضیکہ حکام کی بدظنی اور نفرت کی کوئی حد باقی نہ رہی تھی کسی شخص کا صرف مسلمان ہونا ہی اُس کو بدتر سے بدتر جرم کا مرتکب ٹھہرانے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ نفرت اور بدظنی تمام انگلش نیشن میں سرایت کر گئی تھی تمام اینگلو انڈین اخبار اور ولایت کے اخبار مسلمانوں کے برخلاف اشتعال پیدا کرنے والے آرٹیکل لکھتے تھے اور انگریزوں کے دل میں عموماً عداوت اور نفرت کا بیج بوتے تھے، گویا مسلمانوں کو نہ ان انگریزوں سے جو ہندوستان میں حکمران تھے اور نہ اُن سے جو ہر سال ولایت سے مختلف خدمات پر مامور ہو کر آتے تھے کوئی امید باقی نہ رہی تھی اور اُن کے حال پر یہ شعر صادق آتا تھا۔ شعر

اکنوں اگر فرشتہ نگو گویدت چہ سود در شہر صد حکایتِ بدنامئ تو رفت

اگرچہ انگریزوں کی یہ نفرت اور بدگمانی جیسا کہ سرسید مرحوم نے رسالہ اسبابِ بغاوت اور ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں ثابت کیا ہے اور جس کو بڑے بڑے مدبرانِ سلطنت نے آخر کار تسلیم کر لیا ہے محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ ان غلط فہمیوں کا ہونا نہایت قرین قیاس تھا۔ انگریز ہندوستانیوں کی عادت، طبیعت، اُن کی حالت اور اُن کے طرز خیالات سے ناواقف تھے۔ ملک کی حکومت اُنھوں نے

مسلمانوں سے لی تھی اور اُن ہی کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا دعویدار سمجھتے تھے اور بقول سرسید کے اُن کے اس خیال کی تائید کے لئے بھس بھری ہوئی مردہ کھال دلّی کے قلعہ میں موجود تھی۔" مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی دھوم تھی اور اُن میں سے بعض جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگ اپنی وحشیانہ حرکتوں سے ان تعصبات کا کافی ثبوت دے چکے تھے اور چند مچھلیاں سارے تالاب کو گندہ کر چکی تھیں۔ ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ تمام مسلمان من حیث القوم انگریزوں کی غلط فہمی کا شکار ہوجائیں۔

پس کیا انگریز کیا ہندو اور کیا مسلمان کسی سے اس نازک وقت میں یہ امید نہ تھی کہ اس پانچ کروڑ مخلوق کے بیڑے کو اس طوفان عظیم کے صدمہ سے بچائے۔ مگر خدا مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ اُس نے جہاں کوئی بیماری پیدا کی ہے وہیں اُس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔ وہی مغضوب و معتوب شہر جہاں کے مسلمان سب سے زیادہ مورد آفات تھے اور جس پر اگر خدا کا رحم لارڈ لارنس مرحوم کے قالب میں ظہور نہ کرتا تو اُس کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا، اسی شہر کے مسلمانوں میں سے ایک شخص اٹھا جس نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوستان کی تمام رعایا کو عام بغاوت اور عام سازش اور گورنمنٹ کی عام مخالفت کے الزام سے بری کیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مدبرانِ سلطنت نے تسلیم کرلیا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر کسی ملکی سازش یا عام بغاوت پر مبنی نہ تھا بلکہ صرف سپاہ کی جہالت اور مذہبی توہمات کا نتیجہ تھا جس کی نسبت لارڈ لارنس مرحوم نے آخر کار فیصلہ کردیا کہ محض کارتوس کی بدولت ایک سپاہیوں کا ہنگامہ تھا اور سر ولیم کے انڈر سکرٹری وزیر ہند کے نہایت انصاف سے (جیسا کہ سرسید بیان کرتے تھے) اُس کو سپائی وار سے تعبیر کرتے تھے نہ ملکی بغاوت سے۔ مگر باوجود اس کے بھی مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کے دل صاف نہ ہوئے اور وہ اُن کو بدستور انگلش گورنمنٹ کا بدخواہ اور انتظام کا دشمن خیال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۱ء میں یعنی غدر کے زمانے سے پندرہ برس بعد ڈاکٹر ہنٹر

صاحب نے اپنی کتاب "آور انڈین مسلمانز" میں صاف لکھا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لئے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں"۔

صاحبو! میں اس موقع پر سرسید کی ان کوششوں کی تفصیل بیان کرنی نہیں چاہتا جو انھوں نے مسلمانوں پر سے اس داغ کے چھٹانے میں کی ہیں۔ کیونکہ وہ ۱۸۵۷ء سے لے کر آخری وقت تک جو اکتالیس برس کا زمانہ ہوتا ہے برابر اسی دھن میں لگے رہے ہیں کہ قوم کی پولیٹکل حالت درست ہو، گورنمنٹ میں اُنکا اعتبار زیادہ ہو، انگریزوں میں اور اُن میں ربط و اتحاد کو ترقی ہو اور وہ اپنی ہموطن قوموں سے عزت میں مرتبہ میں اور گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہونے میں کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ اس غرض سے جو جو کام اور جو جو کوششیں اُنھوں نے اس اکتالیس برس کے عرصہ میں کی ہیں اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے۔ یہاں تک کہ میرے نزدیک ایک شخص کا ہرگز کام نہیں کہ اُن کی قومی خدمات کو بالاستیعاب اُن کی لائف میں بیان کر سکے۔ مگر جہاں تک کہ امکان میں تھا ان خدمات کا مفصل ذکر اُن کی لائف میں کیا گیا ہے جو عنقریب پبلک کی نظر سے گذرنے والی ہے۔ پس میں اس ذکر کو چھوڑ کر صرف ان نتائج کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس مرحوم کی کوششوں سے ملک اور قوم کے حق میں مترتب ہوئے۔

صاحبو! جس کام کا بیڑا سرسید نے اٹھایا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مسلمانوں کا سیدھے رستے پر ڈالنا ایسا ہی مشکل تھا جیسا دریا کا بہاؤ کی سمت سے دوسری طرف رخ پھیر دینا۔ اور انگریزوں کو اس بے اعتباری اور بدگمانی کے بعد جس کا غدر کے واقعات نے اُن کے دل میں نقش بٹھا دیا تھا مسلمانوں کی طرف سے صاف کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ایک طرف سے سرسید کو یہ آواز آتی تھی کہ جبل گردد جبلی نہ گردد اور دوسری طرف سے ان کو یہ جواب ملتا تھا کہ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ مگر اس کوہ وقار

شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری، یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا۔ اس نے ایک جماعت کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کردی جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے، اس کو ہندوستان کے حق میں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روز سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو اُن کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنی سلامتی بلکہ اپنا وجود ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں، ان کو اپنے اسلاف کی اقبالمندی کے خواب نظر آنے موقوف ہو گئے ہیں، وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں، انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے، ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں۔

سرسید نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنی پرزور تحریروں اور تقریروں سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے خیالات کی اصلاح کر دی ہو بلکہ وہ اپنی قوم میں وفاداری اخلاص اور اطاعت کا ہمیشہ کے لئے بیج بو گیا ہے۔ وہ اُن کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا بارآور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری اور فرمانبرداری ہے ؎

کوہ ہا کندست تا ایں جوئے شیر آوردہ است   بو کہ آبِ رفتہ در جوئے شما آید ز سر

جس طرح اُس نے قوم کے خیالات کی اصلاح کی اور اُن میں ہمیشہ کے لئے وفاداری اور اخلاص کی بنیاد ڈالی اسی طرح اُس نے حکمراں قوم کی نظر میں جہاں تک کہ ممکن تھا اُن کا اعتبار بڑھانے میں کوشش کی اور وہ تمام شکوک و شبہات جو انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئے تھے اور جو بظاہر کسی طرح مٹنے والے نہ تھے

ان کو مٹایا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو کچھ اپنی کتاب "آور انڈین مسلمانز" میں مسلمانوں کے برخلاف لکھا تھا بڑے بڑے جلیل القدر حاکموں نے اس کی تردید کی۔ پایونیر میں ایک بڑے لائق عربی داں انگریز کا بہت بسوط آرٹکل جس کی نسبت یقین کیا گیا تھا کہ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کا لکھا ہوا تھا، انھیں دنوں میں شایع ہوا۔ اس میں صاف لکھا تھا کہ وہابیوں کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ درپردہ تخریب سلطنت کی فکر میں رہتے ہیں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتے ہیں اور غدر و بغاوت کی تحریک کرتے ہیں (جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا تھا) محض تہمت ہے" سر الیفرڈ لائل نے اپنے ایک لیسے میں جو تھیالوجیکل ریویو میں لکھا کہ اُس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کردیتا ہے اور بہتر ہوتا اگر وہ اس جن کو اتار دیتا" انڈین آبزرور کے ایڈیٹر نے جو خود انگلش مین تھا اور اس کا اخبار تمام اینگلو انڈین افسروں کی رائے کا آئینہ تھا، جب سرسید کا ریویو کتاب مذکور کے برخلاف شائع ہوا تو ایک نہایت زبردست آرٹکل سرسید کی تائید میں لکھا، جس میں درحقیقت ڈاکٹر ممدوح کی کتاب کی دھجیاں اُڑائی تھیں اور جس کا پہلا فقرہ یہ تھا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اس گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانان ہندوستان کی قدرو منزلت کی بابت بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہنا اچھا ہے کہ اُس کے لچر و پوچ ہونے کی بابت تصفیہ کر دیا ہے۔ جہاں تک کہ ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کو لاثانی سمجھتے ہیں، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ کسی مصنف نے دیدہ دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو"

سرسید کے ریویو کا اثر جو کچھ کہ گورنمنٹ پر ہوا اُس کا اندازہ جیسا کہ معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس ریویو کے شائع ہونے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں ہوا، حالانکہ کئی برس سے ان کی گرفتاری برابر جاری تھی۔ خود ڈاکٹر ممدوح کے خیالات جہاں تک کہ قیاس ہو سکتا ہے سرسید کا ریویو دیکھنے کے بعد بدل گئے تھے اور ان

مسلمانوں کے ساتھ یقیناً بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ جیسا کہ ان کو اس برتاؤ سے، جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ ان سے ظہور میں آیا، ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے مدرستہ العلوم کی پختہ بارک میں ایک کمرہ بنانے کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جبکہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریزیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڈھ میں کیا۔ اور اپنی آخری اسپیچ محمدن کالج میں آکر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور اُن کی کوششوں کی بے انتہا تعریف کی اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی۔

سرسید کی کوشش سے جو اعتبار حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوا ہے اُس کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے مشہور اخبار پال مال گزٹ مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات پر یہ فقرہ لکھا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کتاب میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں مبارکباد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر دے سکتے ہیں۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا سچا دوست رہا اور جو اس نے خدمتیں کیں اُن کی قدر وقیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا"۔

اسی طرح سر آکلنڈ کالون نے جیسا کہ مسٹر تھیوڈور بیک نے سرسید کے ماتمی جلسہ میں بیان کیا تھا لفٹنٹ گورنری کے زمانہ میں اس مرحوم کی نسبت یہ فرمایا تھا کہ "کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسیّد نے کی ہے"۔

ظاہر ہے کہ سرسید نے نہ کسی ملکی معاملہ میں کوئی سفارت کی خدمت انجام دی تھی نہ کوئی ملک فتح کیا تھا نہ کوئی کالونی آباد کی تھی نہ کسی صوبہ کا بندوبست کیا تھا پھر وہ کونسی خدمت اور کونسی کوشش سرسیّد نے کی تھی جس کا ذکر انگلستان کے اس نامور اخبار نے اور

ہندوستان کے اس جلیل القدر مدبر نے کیا ہے ؟ وہ یہی خدمت اور یہی کوشش تھی کہ جس قوم سے انگریزوں نے سلطنت لی تھی، جس کو وہ اپنا حریف جانتے تھے، جو مذہبی تعصبات میں شہرۂ روزگار تھی اور گورنمنٹ کے حق میں سخت خطرہ کی چیز سمجھی جاتی تھی، اس میں صرف اسی شخص نے اپنے زبردست ہاتھوں سے لائلٹی اور وفاداری کا بیج بویا ہے اور حکمران قوم کو کم سے کم اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ ہماری حکومت کو مسلمانوں کی طرف سے کچھ خطرہ نہیں ہے۔ کرنل گرہم سرسید کی لائف میں لکھتے ہیں

"غدر کے زمانے میں اور بہت مدت بعد تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی ہوئی تھی۔ اس خوفناک زمانہ کے تمام مکروہات ان کی طرف منسوب کئے جاتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ یہ تعصب زیادہ تر بیجا تھا۔ مسلمانوں کو اس کا بہت رنج تھا اور یہ بات اُن کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ ظاہراً کسی شخص نے ان کی حمایت کی حامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا، انھوں نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر درست کیا۔"

ایک اور نہایت لائق اور شریف انگریز نے سرسید کی وفات کے بعد جو ان کی پولیٹکل خدمات پر ایک آرٹکل لکھا تھا، اس میں بھی اسی کے قریب قریب لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "غدر سے پہلے اور اس کے چند سال بعد تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر ان کو ترقی دینے اور ان کی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ نہایت نمایاں انقلاب جو حال میں اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے، یہ صرف سرسید کی تلقین کا نتیجہ ہے۔ اس نے مسلمانوں کے دل میں جہاں پہلے نفرت اور بدگمانی ہوتی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ مسلمان وفادار ہیں۔"

صاحبو! یہ بہت بڑا احسان سر سید کا اپنی قوم پر تھا۔ عربی میں یہ مثل مشہور ہے ثبت العرش ثم نقش (یعنی پہلے چھت قائم کر لو پھر نقش و نگار قائم کرنا)۔ اسی طرح ایک قوم کے خیر خواہ کا سب سے مقدم کام یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کی پولیٹیکل حالت درست کرے، قوم کو گورنمنٹ کا خیر خواہ بنائے، اور گورنمنٹ کو اس پر مہربان کرے۔ اگرچہ بظاہر سر سید کی اس کوشش میں بہ نسبت قوم کی خدمت کے گورنمنٹ کی خدمت کا پہلو غالب ہوتا ہے لیکن اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سراسر قوم کی خدمت اور خیر خواہی کا کام تھا۔ مسلمانوں اور انگریزوں کی مثال چھری اور خربوزے کی تھی۔ پس مسلمانوں کے تعلقات اگر برٹش گورنمنٹ کے ساتھ خدانخواستہ ویسے ہی رہتے جیسے کہ غدر کے بعد ہو گئے تھے تو گورنمنٹ کو اس سے زیادہ تکلیف نہ ہوتی جتنی کہ چھری کو خربوزہ کاٹنے میں ہوتی ہے۔ مگر خربوزے کا کام تمام ہو جاتا۔

بیشک یہ کام سب سے مقدم اور سب سے زیادہ مشکل تھا۔ مگر اے صاحبو یہ نہ سمجھنا کہ سر سید نے مسلمانوں کو صرف ہی فائدہ پہنچایا ہے یا مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی اور قوموں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ اُس کے احسانات جو ملک اور قوم پر ہیں، وہ حصہ اور شمار کے اندازہ سے باہر ہیں۔ اُسی نے سب سے پہلے گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کو سمجھایا کہ جب تک دیسی لوگ لیجسلیٹو کونسل میں ممبر نہ ہوں گے، اس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں جن کا یہ نتیجہ ۱۸۵۷ء کا غدر تھا رفع نہ ہوں گی، چنانچہ گورنمنٹ نے ان کی صلاح کے موافق عمل کیا۔ رسالہ اسباب بغاوت جس میں یہ صلاح دی گئی تھی ۱۸۵۸ء میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں تین ہندوستانی رئیس پہلی ہی بار کونسل کی ممبری پر نامزد کئے گئے۔

اسی نے رسالہ مذکور میں سب سے پہلے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدے نہیں دئے جاتے۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی

گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شمبو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے، ملنے لگے۔

اسی نے شمالی ہندوستان میں سوسائٹیاں اور انجمنیں اور سبھائیں قائم کرنی لوگوں کو بتلائیں۔ سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ سے پہلے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کہ کوئی قومی مجلس یا سوسائٹی اودھ، اضلاع شمال مغرب اور پنجاب میں ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں یا ہندؤں نے ملک یا قوم کی بھلائی کے لئے قائم کی ہو خصوصاً مسلمانوں میں ایک مجلس کے سوا جو کلکتہ میں مجلس مذاکرہ علمیہ کے نام سے قائم تھی اُس وقت تک کوئی مجلس ہندوستان کے کسی صوبہ میں قائم نہیں ہوئی تھی۔

اسی نے دیسی اخباروں کو جن میں جھوٹی سچی خبروں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا پولیٹکل، سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین کا مخزن بنایا اور بجائے اس کے کہ وہ محض لوگوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے ان کو اس قابل بنا دیا کہ گورنمنٹ اُن کی آواز پر کان لگانے لگی۔

اسی نے اُردو لٹریچر اور اردو زبان کو ایک قطرہ سے دریا بنا دیا۔ قطع نظر اُس بے بہا امداد کے جو خود سرسید کے لٹریری ورکس سے اُردو لٹریچر کو پہنچی اور قطع نظر گرانقدر کوششوں کے جو انھوں نے اُردو زبان کی حمایت میں اخیر دم تک برابر جاری رکھیں، اگر سچ پوچھو تو ۱۸۶۲ء سے اب تک جو اُردو زبان نے غیر معمولی ترقی کی ہے وہ اُسی مرحوم کی تحریکوں کا نتیجہ تھا۔ سوسائٹی کی طرف سے جو ایڈریس انھوں نے سنہ مذکور میں بحضور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب علیگڈھ میں پیش کیا تھا اُس ایڈریس کے جواب میں سوسائٹی کی درخواست کے موافق ہز آنر نے وعدہ کیا تھا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی، اُن میں گورنمنٹ ضرور

امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد سر ولیم میور کی گورنمنٹ نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصہ میں تمام ملک کو دیسی زبان کی تصنیفات سے مالامال کر دیا۔ اگرچہ گورنمنٹ کے انعام سے جو محض ترغیب کے لئے مقرر کیا گیا تھا کچھ زیادہ لوگ مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گذر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام جماعت میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی لیاقت رکھتی تھی برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدۂ عظیم پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے اور اس طرح خاص کر اُردو لٹریچر چند برسوں میں اس قدر ترقی کر گیا جس کی صدیوں تک امید نہ تھی۔

اُسی کی چیخ پکار اور اُسی کی ریس سے اطرافِ ہندوستان میں متعدد پرائیویٹ کالج قائم ہو گئے۔ اُسی نے سب سے پہلے ہندوستانیوں کو سلف ہیلپ کا سبق پڑھایا۔ اُسی نے ان کو اپنے قومی کاموں میں بغیر کسی دباؤ کے چندہ دینا سکھایا۔ اُسی نے اولاد کی تعلیم میں لوگوں کو بے دریغ روپیہ خرچ کرنا بتایا۔ اُسی نے ان کو یہ گُر سوجھایا کہ نالائق اور بے تربیت اولاد کے لئے جائداد خرید کر چھوڑ جانا ان کو دین دنیا سے کھو دینا ہے اور بڑا سلوک اولاد کے ساتھ یہی ہے کہ جو کچھ ہو سکے اُن کی تعلیم و تربیت میں خرچ کیا جائے۔ اُسی نے خاص کر شمالی ہندوستان میں اولاد کو تعلیم کے لئے بھیجنے کی راہ نکالی۔ اور ایک بہت بڑا گروہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمانوں کا ملک میں پیدا کر دیا۔

صاحبو! یہ شاعرانہ مبالغے نہیں ہیں بلکہ بالکل صحیح واقعات ہیں جن کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور اگر کسی کو شبہ ہو تو اس کو چاہئے کہ علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کی جلدیں اول سے لے کر آخر تک دیکھے تاکہ اُس کو معلوم ہو کہ سرسید

سنے ملک اور قوم کی بھلائی کا کوئی کام جو ابتک ہوا ہے ایسا نہیں ہے جس میں اُس مرحوم نے حصہ نہ لیا ہو۔ سب سے بڑی ملک اور قوم کی ہمدرد جماعت آج کل انڈین نیشنل کانگرس سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ سرسید اُس کے طرز عمل کو ناپسند کرتے تھے اور اُس ایجیٹیشن کو بہت بُرا جانتے تھے جو اُس کے بانیوں نے اول اول ہندوستان میں پھیلایا تھا۔ مگر جس اصول پر اُس کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ وہی اصول تھا جو سرسید نے اسباب بغاوت کے بیان کرنے میں سب سے پہلے اختیار کیا تھا۔ اور پھر برٹش انڈین ایسوسی ایشن اُسی اصول پر علی گڈھ میں قائم کی تھی۔ میرے ایک عزیز دوست جو ولایت سے ابھی تعلیم پاکر آئے ہیں اُن کا بیان ہے کہ مسٹر ہیوم بانیِ نیشنل کانگرس نے ولایت میں اُن سے ذکر کیا کہ مجھکو جو ہندوستان میں کانگرس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا وہ صرف سرسید احمد خاں کی کتاب اسباب بغاوت کے دیکھنے سے پیدا ہوا تھا۔ مگر میں نہیں جانتا کہ اب سرسید کی رائے کیونکر اپنی قدیم رائے کے برخلاف ہوگئی۔

ہم اس موقع پر اس سوال کے متعلق زیادہ بحث کرنی نہیں چاہتے۔ مگر ولایت کے مشہور اخبار سینٹ جیمس بجٹ میں جو رسالہ اسباب بغاوت پر ریمارک کیا گیا تھا، اُس میں سے ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں جس سے حاضرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ سرسید کے طریقہ میں جو انھوں نے رسالۂ اسبابِ بغاوت میں اختیار کیا تھا اور نیشنل کانگرس کے طرز عمل میں کیا فرق تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ۔

"ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے، بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں"۔

نیز ہوم نیوز نے اسی کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ "سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کئے تھے، اُن میں بعض نہایت قیمتی اور عملدرآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے نہایت دلیری کے ساتھ

اپنی رائے اس معاملہ پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ ان اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جاسکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔"

مذکورہ بالا ریمارکس سے ظاہر ہے کہ جو اثر صرف ایک شخص کی تحریر نے ایسے غیظ و غضب کے زمانہ میں جیسا کہ غدر کے بعد کا زمانہ تھا گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے خیالات پر اس قدر جلد کیا تھا ویسا اثر نیشنل کانگرس نے جو ہندوستان کے لائق ترین اشخاص کا مجمع ہے اپنی پندرہ برس کی چیخ پکار اور شور وغل سے نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ سر سید نے اپنی شکایتوں سے گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے سوا کیا ہندوستانی اور انگریز کسی متنفس کو مطلع نہیں کیا۔ اور کانگرس کے ممبران نے پچاس ہزار رسالے جن میں گورنمنٹ کی سرتاپا شکایتیں درج تھیں، ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ کرا کر ملک میں عام طور پر تقسیم کئے جن کی نسبت لارڈ ڈفرن نے ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ "کانگرس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد شخصوں میں اُن رسالوں کے تقسیم کرنے کے جوابدہ ہوئے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد صریح سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا۔"

بہرحال اگر بالفرض نیشنل کانگرس کے مقاصد اور اُس کی خواہشوں کو سراسر واجبی اور ملک کے حق میں مفید تسلیم کر لیا جائے تو بھی اُس نے اب تک سر سید کے ایک نفس واحد سے کوئی زیادہ بات اس کے سوا نہیں کی کہ جس گرہ کو سر سید نے ہاتھوں سے کھولا تھا اُس کو کانگرس نے دانتوں سے کھولنے کا ارادہ کیا اور اسی لئے اس کو بہت ہی کم کامیابی ہوئی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن جو سر سید نے ۱۸۶۶ء میں بمقام علیگڈھ آ کر قائم کی

تھی، اُس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درد دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لئے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ مگر چونکہ ملک میں اُس کے چلانے کی قابلیت نہ تھی اس لئے سرسید نے آخر کار اس کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک ہندوستانیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہ پھیلے گی اُس وقت تک یہ تمام سوسائٹیاں اور انجمنیں اور ایسوسی ایشن بے سود ثابت ہوں گی) چنانچہ ولایت سے واپس آکر انھوں نے تعلیم کی بنیاد ڈالی اور اس کی ترقی میں فوق العادہ کوششیں کیں جن سے آپ سب صاحبان بخوبی واقف ہیں اور جو ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا عظیم الشان کام ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے (مگر ایک دلچسپ فقرہ جو ٹائمز آف لندن میں اُن کی وفات کے بعد اُن کی تعلیمی کوششوں کے متعلق چھپا تھا اُس کا اس موقع پر نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ اُس میں سرسید کے بڑے بڑے کاموں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھا تھا کہ اس شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کے بیدار کرنے اور ان کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملہ کا خیال دلوانے میں بہت محنت اور جانفشانی فرمائی اور فی الحقیقت جب اس معاملہ میں ان کی عمر بھر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔)

صاحبو! یہ جو کچھ میں نے بیان کیا یہ اُس مرحوم کی ملکی اور قومی خدمات کا ایک نہایت مختصر بیان تھا جو محض بطور نمونہ کے حاضرین کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ مگر اب تک میں نے اُن کی مذہبی خدمات کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی میرے دل میں کچھ عظمت نہیں ہے۔ میرے نزدیک اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کام خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن کا لکھنا ہے۔ مگر اے صاحبو! ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کی مذہبی خدمات کی جیسی کہ چاہئے مسلمانوں میں قدر ہو۔ مذہبی خیالات کا یقین

جس طرح کسی دلیل سے انسان کے دل میں نہیں بیٹھا بلکہ محض اگلوں کی تقلید سے بیٹھتا ہے۔ اسی طرح اُن کا یقین کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہو سکتا۔ پس سرسید کی مذہبی تصنیفات کی ضرورت اور اُن کی وقعت کیسی ہی پختہ اور مضبوط دلیلوں سے ثابت کیجائے، موجودہ حالت میں ہرگز امید نہیں کہ لوگ اس کو تسلیم کریں۔ مگر میرے نزدیک وہ زمانہ کچھ بہت دور نہیں ہے جبکہ سرسید کی مذہبی خدمات کی پوری پوری قدر کیجائے اور گو اُن کی بعض رائیں اور خیالات قابل اعتراض سمجھے جائیں۔ مگر بہت بڑا حصہ اُن کی تحقیقات کا آب زر سے لکھنے کے قابل سمجھا جائے گا۔ سرسید نے خود ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا تھا کہ "اگر زمانہ کی ضرورت مجھکو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کرکے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جبتک ایسا زمانہ نہ آئے اُس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں۔ اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سردست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔"

چونکہ اس مرحوم کا اپنی تفسیر کی نسبت یہ خیال تھا اس لئے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کے اس عام مجمع میں ان کی مذہبی خدمات کا ذکر کروں۔ اور اُن کے احسانات کے ضمن میں ایک ایسی دوا کا بیان کردوں جس کی کرواہٹ سردست محسوس ہوتی ہے اور اُس کے فوائد ابھی تک نامعلوم ہیں۔ البتہ سرسید کی سرکاری خدمات جن کی بدولت انھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدے پہنچائے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ایک عمدہ ترین نمونہ حسن خدمت کا ہیں، بلاشبہ اس قابل ہیں کہ ہر مسلمان کو اُن کا احسانمند اور شکرگزار ہونا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی سرکاری خدمات بھی اس وقت تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیجا سکتیں۔ اس لئے میں صرف پال مال گزٹ اور سر آکلنڈ کالون کے مذکورہ بالا فقروں کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ جو خدمتیں اُس

نے کیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔" اور کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جیسی کہ سرسید نے کی ہے۔"

ایام غدر کی خدمات کے متعلق صرف جان اسٹریچی کے یہ مختصر الفاظ لکھنے کافی ہیں کہ "کسی شخص نے اُس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں سید احمد خاں نے دیا۔ میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے اُس کی جاں نثاری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے۔"

اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسے شخص کی یادگار قائم کرنی جس کے احسانات میں ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے، ہم سب مسلمانوں کا قومی فرض ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو خود اپنے اوپر احسان کرنا ہے کہ جو یونیورسٹی اُن کی یادگار میں قائم ہونی تجویز ہوئی ہے، وہ ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ایک سرچشمہ ہوگی اور ہماری قوم کی سوکھی ہوئی کھیتی کو پھر سرسبز و شاداب کرے گی اور ہماری اولاد کو ہمیشہ اُس شخص کے احسانات یاد دلائے گی جو اُن عنقا صفت لوگوں میں سے تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بنی نوع کے ہر مصیبت میں یاور ‎ ‎ ‎ ‎ ہوا خواہِ ملت، بہ اندیش کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور ‎ ‎ ‎ ‎ جہاں کی پُرآشوب کشتی کے لنگر

ہر اک قوم کی ہست و بود ان سے ہے یہاں
سب اس انجمن کی نمود ان سے ہے یہاں

کسی پر ہو سختی، صعوبت ہے ان پر ‎ ‎ ‎ ‎ کسی پر ہو غم، رنج و کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت، مصیبت ہے ان پر ‎ ‎ ‎ ‎ کہیں آئے آفت، قیامت ہے ان پر

کسی پر چلیں تیر، آماج یہ ہیں
لُٹے کوئی رہ گیر، تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے | یہ پیماں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوجِ حوادث سے ہیں لڑنے والے | یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے

اُمنڈتا ہے رُکنے سے اور ان کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا

جماتے ہیں جب پاؤں، ہٹتے نہیں یہ | بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب، پھر سمٹتے نہیں یہ | جہاں بڑھ گئے، بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ

بھم بن کے سستا نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جوانِ کو قوت | سمائی ہے دل میں بہت اُس کی عظمت
نہیں پھیرتی اُن کا منہ کوئی زحمت | نہیں کرتی زیر اُن کو کوئی صعوبت

بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار اُن کو | ہر اک راہ ملتی ہے ہموار اُن کو
گلستاں ہے صحرائے پُرخار اُن کو | برابر ہے میدان و کہسار اُن کو

نہیں حائل اُن کے کوئی رہگذر میں
سمندر ہے پایاب اُن کی نظر میں

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انھیں سے | زمانہ کا ہے گرم بازار انھیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انھیں سے | کھلے ہیں خدائی کے اسرار انھیں سے

انھیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو

انھیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

انھیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت
انھیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انھیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت
انھیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت

دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انھیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

انھیں کا اجالا ہے ہر رہ گذر میں
انھیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انھیں کا ظہورا ہے سب خشک و تر میں
انھیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں

انھیں سے یہ رتبہ تھا آدم نے پایا
کہ سر اس سے روحانیوں نے جھکایا

۸۔ تقریر متعلق وکٹوریا میموریل لائبریری پانی پت

(قلمی مسودہ سے نقل کیا گیا)

ملکہ وکٹوریا آنجہانی کے انتقال پر باشندگانِ پانی پت نے کچھ روپیہ ملکہ کی کسی یادگار کے قائم کرنیکے لئے جمع کیا تھا۔ مولانا کی تحریک سے ایک پبلک لائبریری پانی پت میں اُس روپے سے قائم کی گئی اور مولانا اُس کے سکرٹری بنائے گئے۔ یہ تقریر اُسی لائبریری کے متعلق مولانا نے باشندگانِ پانی پت کے ایک عام جلسہ میں فرمائی تھی۔

جناب صدر انجمن و جملہ حاضرین جلسہ!

آپ سب صاحبوں کو آج اس جلسہ میں ایک ایسے کام کے لئے تکلیف دی گئی ہے جو تمام قصبہ کی بھلائی سے علاقہ رکھتا ہے۔ اور قصبہ کا ہر ایک باشندہ اس میں رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ حضور ملکہ معظمہ مرحومہ کی وفات پر شہر کے تمام باشندوں نے نہایت جوش و وفاداری سے اُس نیک دل ملکہ کی (جس کی نیکی تمام دنیا میں مشہور ہے) ایک علمی یادگار قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس کام کے لئے عام چندہ کی فہرست کھولی گئی اور شہر کے عام باشندوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے اس میں اپنی اپنی حیثیت اور مقدور کے موافق چندہ دیا۔ یہاں تک کہ چندہ کی تعداد کچھ اوپر تین ہزار تک پہنچ گئی۔ اولاً سب کی یہ رائے تھی کہ قصبہ میں جو مڈل اسکول ہے اس کو بیادگار ملکہ مرحومہ دو جماعتیں اور اضافہ کرکے ہائی اسکول بنا دیا جائے۔ مگر چونکہ میونسپل کمیٹی کی امداد بغیر ہائی اسکول قائم ہونا ممکن نہ تھا اور کمیٹی میں اُس وقت روپے کی کمی تھی، اس لئے وہ تجویز پوری نہ ہو سکی۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ چندہ کے

روپے سے ایک کتب خانہ شہر میں قائم کیا جائے جس سے تمام باشندے برابر فائدہ اٹھا سکیں۔ اس رائے کو جناب ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور جناب آغا سید جلال شاہ صاحب تحصیلدار نے بھی پسند کیا۔ اور چونکہ سنہ[1] میں ڈرمنڈ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر سابق کی تجویز سے کتب خانہ کے واسطے یہ مکان کئی ہزار کی لاگت سے تیار ہو چکا تھا اور اس کی تیاری میں بھی پبلک ہی کا روپیہ جو جوبلی کے اخراجات سے بچ رہا تھا خرچ ہوا تھا اس لئے ۱۹۰۵ء میں یہ کتب خانہ اس مکان میں قائم کیا گیا۔ چونکہ اس قصبہ میں ایک عام کتب خانہ کا قائم ہونا جس سے ہر پڑھا لکھا آدمی فائدہ اٹھا سکے بالکل ایک نئی بات ہے اس لئے اصل مطلب بیان کرنے سے پہلے میں کتب خانہ کے فوائد کے متعلق چند الفاظ آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہوتی ہے کہ طالب علم اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد اگر کسی علم یا فن میں کمال حاصل کرنا چاہے تو کتابوں کے مطالعہ سے بغیر استاد کی مدد کے کمال حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جب تک کتابوں کا معقول ذخیرہ موجود نہ ہو کسی علم کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے یورپ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا گانوں بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس میں کم سے کم ایک یا دو عام کتب خانے موجود نہ ہوں۔ یہ کتب خانے لوگوں کے عام چندہ سے قائم کئے جاتے ہیں اور بستی کا ہر ایک باشندہ اُن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسے کتب خانہ کو پبلک لائبریری کہتے ہیں۔ یورپ میں جو ہمیشہ بڑے بڑے عالم اور مصنف اور موجد اور صنّاع پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہاں کے تمام ملکوں میں علم کا دریا بہتا نظر آتا ہے وہ

---

(۱) مولانا کے اپنے لکھے ہوئے جس مسودہ سے یہ تقریر نقل کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں سنہ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔

انھیں پبلک لائبریریوں کا صدقہ ہے۔ ہمارے قصبہ کے اکثر اصحاب اس لائبریری کو بالکل بے سود اور نکمی چیز سمجھتے ہیں اور کتابوں کے خریدنے میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اُس کو روپیہ کا ضائع کرنا جانتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ نیا کام کیسا ہی مفید ہو اول اول لوگ اس سے ہمیشہ وحشت اور نفرت کیا کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ یورپ میں جب گھنٹہ ایجاد ہوا تو جس شخص نے سب سے پہلے اس کو خرید کر اپنے کمرے میں رکھا اُس کو تمام رات گھنٹے کی کھٹ کھٹ سے نیند نہ آئی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی آواز سے ایسا مانوس ہوگیا کہ اُس کے بغیر اس کو نیند نہ آتی تھی۔ جب پانی پت میں اول ہی اول مدرسہ قائم ہوا تو بہت ہی کم لوگ اس میں اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے بھیجتے تھے مگر اب ہر شخص کی یہ آرزو ہے کہ یہاں بجائے مڈل اسکول کے ہائی اسکول قائم ہو جائے۔ اسی طرح اول اول شفاخانہ میں بہت ہی کم لوگ علاج کے لئے جاتے تھے مگر اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ شہر میں دو شفاخانے جاری ہو جائیں اور بڑے شفاخانہ میں ہوسپٹل اسسٹنٹ کی جگہ اسسٹنٹ سرجن مقرر کیا جائے۔ امید ہے کہ اسی طرح ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اس لائبریری کو شہر کے حق میں ایک چشمۂ فیض سمجھیں گے اور گو اس وقت ہم نہ ہوں گے مگر جن لوگوں کی کوششوں سے یہ لائبریری قائم ہوئی ہے ہمارے بعد اُن کی دل سے قدر کریں گے اور اُن کو شہر کا خیر خواہ سمجھیں گے۔

اب میں اصل مطلب جس کے لئے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی گئی ہے بیان کرتا ہوں۔ ایک روبکار محکمۂ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے بنام صاحب پریزیڈنٹ میونسپل کمیٹی مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۶ء اس مضمون کی صادر ہوئی ہے کہ چونکہ لائبریری کی ذمہ داری ممبران میونسپل کمیٹی کے سپرد کی گئی ہے ان کو چاہئے کہ کمیٹی اول لائبریری کا چارج لے اور پھر ایک سب کمیٹی مقرر کرے جس میں ۴ یا ۵ ممبران لائبریری کے لئے مقرر کئے جائیں۔ اسی روبکار میں کمیٹی سے ایک ایسا نقشہ طلب کیا گیا ہے

جس سے ظاہر ہو کہ خرچ کرنے کا اور فنڈ اور لائبریری کے انتظام کا کس طرح بندوبست کیا جائے گا۔

اس روبکار کا منشا جیسا کہ ظاہر ہے صاف یہ پایا جاتا ہے کہ لائبریری اور اُس کے انتظام کو میونسپل کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن ہم کو اس حکم کی تعمیل میں چند عذرات ہیں اور ہم کو امید ہے کہ جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ان عذرات پر ضرور لحاظ فرمائیں گے۔

(۱) یہ لائبریری پبلک کے چندہ سے حضور ملکہ معظمہ کی یادگار میں قائم ہوئی ہے اور اس لئے بغیر مرضی چندہ دہندگان کے میونسپل کمیٹی کے سپرد نہیں ہو سکتی۔

(۲) شہر کے عام باشندے میونسپل کمیٹی کو ایک سرکاری محکمہ سمجھتے ہیں پس اگر لائبریری میونسپل کمیٹی کے سپرد کی گئی تو سب لوگ اس کو ایک سرکاری کتب خانہ سمجھیں گے اور ان کو اس کے ساتھ بالکل دلچسپی باقی نہ رہے گی۔

(۳) بعض ممبران نے بیس پچیس روپیہ کی کتابیں اپنی طرف سے لائبریری کی نذر کی ہیں اور کچھ اوپر سو روپیہ کی عربی کی نایاب کتابیں سکرٹری حیدرآباد سے پبلک لائبریری کے لئے اپنے ساتھ لایا ہے جو سرکار نظام کے مطبع سے ہماری لائبریری کو مفت عطا ہوئی ہیں اور کچھ اور کتابیں عنقریب آنے والی ہیں۔ ظاہر ہے کہ لائبریری کو اس قسم کی امداد اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ پبلک لائبریری سمجھی جائے اور اس کی ترقی میں لوگ اسی حالت میں کوشش کریں گے کہ اس کو شہر کے عام باشندوں کا کتب خانہ سمجھیں۔ لیکن اگر وہ ایک سرکاری کتب خانہ تصور کیا گیا تو پبلک کا شوق سرد پڑ جائے گا اور لوگوں کی آمد و رفت کتابوں اور اخباروں کے مطالعہ کے لئے بند ہو جائے گی اور اس طرح لائبریری کا چند روز میں خاتمہ ہو جائے گا۔

(۴) یہ لائبریری اُس چندہ سے قائم کی گئی ہے جو شہر کے عام باشندوں نے حضور ملکہ معظمہ کی یادگار قائم کرنے کے لئے بغیر کسی حاکم یا افسر کے دباؤ کے بڑے شوق

سے ادا کیا ہے۔ ایسی لائبریری کو پبلک کے ہاتھ سے نکال کر میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں دیدینا یقیناً اُن کی دل شکنی کا باعث ہوگا۔

(۵) لائبریری ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے اور ہماری یہ آرزو ہے کہ اس کو اس درجہ تک ترقی دیجائے جو حضور ملکہ معظمہ کی یادگار کے شایاں ہو لیکن میونسپل کمیٹی کے ہاتھ میں جانے کے بعد ہم کو امید نہیں ہے کہ ہماری یہ آرزو پوری ہو سکے۔ میونسپل کمیٹی کے ذمہ پہلے ہی رفاہ عام کے بہت سے کام ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ لائبریری کو اپنی نگرانی میں حالت موجودہ پر قائم رکھ سکتی ہے لیکن اس کو ترقی دینا اور اس کے لئے ہر علم و فن اور ہر زبان کی کتابیں مہیا کرنا اور بک سیلروں سے خط و کتابت کرنا اور اُس کا حساب کتاب صاف رکھنا اور اُس کی جانچ پڑتال کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے۔

(۶) بے شک ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ایسے پبلک فنڈ کی طرف سے جیسا کہ وکٹوریہ میموریل فنڈ ہے ضلع کے حاکم اعلیٰ کو مطمئن کرنا اور اُس کا حساب کتاب ہر وقت صاف رکھنا کمیٹی لائبریری کا فرض ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے صاحبان ڈپٹی کمشنر کو (جو کوئی ہو) لائبریری کا پیٹرن یعنی مربی و سرپرست ہمیشہ کے لئے قرار دیا ہے اور اس کی اطلاع ہم جناب ٹامسن صاحب بہادر کو گزشتہ موسم سرما میں دے چکے ہیں اور انھوں نے بخوشی پیٹرن ہونا منظور کر لیا ہے۔ اور اب ان کی عدم موجودگی میں جناب آس بورن صاحب بہادر قائم مقام ڈپٹی کمشنر ہماری کمیٹی کے پیٹرن ہیں۔ اس کے سوا تحصیلدار صاحب اور آٹھ ممبر میونسپل کمیٹی کے ہماری کمیٹی کے بھی ممبر ہیں۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب بورڈ اسکول جو کہ ایک معزز عہدہ دار سرکاری ہیں اور سکرٹری میونسپل کمیٹی دونوں ہماری کمیٹی میں سکرٹری شپ کا کام انجام دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام عہدیدار اور شہر کا ہر فرد بشر جس نے میموریل فنڈ میں کم یا زیادہ چندہ دیا ہے ہر وقت اختیار رکھتا ہے کہ لائبریری کے انتظام کو آکر دیکھے، اس کے رجسٹروں کو ملاحظہ

رہے، جو غلطی ہو اس کی اصلاح کرے اور جو بات لائبریری کے حق میں مفید ہو اس کے
لئے سکرٹری یا محرر کو ہدایت کرے۔ اس سے زیادہ لائبریری کی طرف سے صاحب
ڈپٹی کمشنر بہادر اور نیز پبلک کا اور کیا اطمینان ہو سکتا ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے
ہیں کہ لائبریری کا انتظام ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور بہت کچھ اصلاح طلب ہے،
اس کے قواعد بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوئے مگر زیادہ تر اس کا سبب یہ ہے کہ
سکرٹری ایک نہایت ضروری کام کے لئے چھ مہینے تک لائبریری سے غیر حاضر رہا
اور اس کی عدم موجودگی میں بہت سے کام بند رہے یہاں تک کہ کتابوں کی خریداری
بالکل موقوف ہو گئی۔ مگر اب امید ہے کہ قواعد بھی مکمل ہو جائیں گے اور کتابوں کی
خریداری بھی جاری ہو جائے گی۔

۹۔ تقریرِ صدارت

(از علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۰۸ء)

دسمبر ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا اس کے پریسیڈنٹ تھے۔ نیچے وہ تقریر درج کیجاتی ہے جو آپ نے اس موقع پر صدارتی حیثیت سے فرمائی

حضرات! جو عزت کہ آج مجھکو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا پریسیڈنٹ بنانے سے دی گئی ہے جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی کوئی معقول وجہ اس کے سوا خیال میں نہیں آتی کہ چونکہ سندھ میں انگریزی تعلیم گویا بالکل مفقود ہے اس لئے شاید یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس موقع پر صدر انجمن ایک ایسے شخص کو بنایا جائے جو انگریزی کا ایک حرف نہ جانتا ہو ورنہ میں اپنے تئیں ہرگز اس جلیل القدر منصب کے لائق نہیں سمجھتا۔ لیکن ہر حال میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میں نہایت ادب سے تمام حاضرین کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اس عظیم الشان خدمت کے ادا کرنے میں میری کم لیاقتی کے سبب جو فروگذاشت یا کوتاہی ظہور میں آئے اُس سے درگذر فرمائی جائے اور آج کی صدارت کو اُن عالی درجہ اور عالی مقام بزرگوں کی صدارت کے پیمانہ سے نہ جانچا جائے۔ جو گذشتہ اجلاسوں میں اس معزز کرسی پر جلوہ فرما چکے ہیں۔

صاحبو! پہلے اس سے کہ کانفرنس کے اصلی مقصد کے متعلق کچھ بیان کیا جائے میں چند الفاظ اُس دردناک واقعہ کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں جس سے نہ صرف ہماری قوم کو بلکہ خاص کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی نہایت سخت صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کو معلوم

ہے کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۸۶ء میں بعد قیام مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے اس کانفرنس کی بنیاد اس لئے ڈالی تھی کہ اس کے ذریعہ سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی منادی کی جائے۔ چنانچہ اُس قوم کے فدائی نے باوجود کبرسن اور طرح طرح کے موانع اور معذوریوں کے جس طرح اول کالج کے لئے لمبے لمبے سفر کئے۔ اسی طرح ملک کے مختلف مقامات میں خود پہنچ کر کانفرنس کے اجلاس منعقد کرائے اور ایک حد تک تعلیم کی منادی اطراف وجوانب میں کر کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ لیکن اس مرحوم کی زندگی میں کانفرنس کا دورہ صرف پنجاب اور ممالک متحدہ کے چند خاص خاص شہروں میں محدود رہا۔ مگر ان کی وفات کے بعد جب کہ تمام قوم پر مایوسی چھائی ہوئی تھی اور کالج اور کانفرنس بلکہ تمام قومی کاموں کی طرف سے مختلف قسم کے تردد آمیز خیالات دلوں میں موج زن تھے، خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ سے قوم کی کشتی بانی کے لئے ایک ایسے شخص کو کھڑا کر دیا جس نے کالج اور کانفرنس دونوں کے حق میں فی الحقیقت مسیحائی کا کام دیا اور قوم کے مردہ اور افسردہ دلوں میں ازسرنو جان ڈال دی اور پانسو برس کے بعد لسان الغیب کی یہ بشارت پوری ہوئی کہ

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد

آپ سب صاحب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس قوم کے مسیحا سے میری کیا مراد ہے۔ خدائے تعالیٰ نواب محسن الملک کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، انھوں نے کالج اور کانفرنس کو سرسید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صرف اپنی قدیم حالت ہی پر قائم نہیں رکھا بلکہ چند سال کے عرصہ میں دونوں کی بالکل کایا پلٹ دی اور اُن کو اس درجہ تک پہنچا دیا جو امید و توقع اور وہم و گمان سے بالاتر تھا۔ نواب محسن الملک کے عہد میں جو غیر مترقبہ ترقیات کالج کو نصیب ہوئیں اُن کی تفصیل بہت طولانی ہے جس کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے مگر جو وسعت اور عام قبولیت کانفرنس کو اُن کی بدولت حاصل ہوئی وہ بھی ایک کارنامہ ہے جو

مسلمانوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ہندوستان کا کوئی حصہ (الا ماشاء اللہ) ایسا باقی نہیں رہا جہاں اس جواں مرد کہن سال کی کوشش اور حسن تدبیر سے کانفرنس کا قدم نہیں پہنچا۔ کلکتہ، مدراس، بمبئی اور ڈھاکہ جیسے دور دست مقامات میں پہنچ کر اُس نے کانفرنس کے اجلاس نہایت دھوم دھام اور تزک واحتشام کے ساتھ منعقد کئے اور مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے عالی ہمتی اور جفاکشی کی ایک مثال قائم کردی۔

مدراس میں سوتوں کو جگایا جاکر | غل علم کا برھما میں مچایا جاکر
چھائی ہوئی مُرنی جہاں قوم میں تھی | وہاں آبِ حیات ان کو پلایا جاکر

افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہم میں موجود نہیں ہے مگر اُس کی جدائی کا داغ بطور قائم مقام کے ہمارے دل میں موجود ہے اور اُس کی یاد نشتر کی طرح ہمارے سینے میں کھٹک رہی ہے۔ کئی سال سے نواب محسن الملک کی صحت نہایت نازک چلی آتی تھی اور نہایت شدید امراض نے اُن کو مغلوب کرلیا تھا مگر وہ ہر حالت میں برابر قوم کی خدمت کرتے رہے اور بیماریوں سے ہمیشہ لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ اُن کا وقت آپہنچا اور قوم اُن کی جلیل القدر خدمات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جس وقت کا کھٹکا تھا وہ وقت آگیا آخر | یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غمخوار | سر کرکے مہم قوم کی کام آگیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا | اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
رہنا تھا زبس قوم کی تقدیر میں بے کس | لکھا ہوا تقدیر کا پیش آگیا آخر
نکبت کا پتہ ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدر | نکبت کا مقدر کو پتہ پا گیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا | پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُس کے | وہ خون کے آنسو اُنھیں رلوا گیا آخر

یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوم کے فدائی — دنیا کو تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر

مہدی کے لئے قوم عزادار ہی ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

صاحبو! فی الواقع نواب محسن الملک کا اس وقت دنیا سے اُٹھ جانا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے عموماً اور اس کانفرنس کے لئے خصوصاً ایک ایسا صدمہ تھا کہ اگر خدا کی مہربانی ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو اُس کی تلافی امکان سے خارج تھی۔ مگر میں تمام ممبران کانفرنس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ قوم نے بالاتفاق نواب مرحوم کا جانشین ایک ایسے معزز و محترم شخص کو منتخب کیا ہے جس کی ذات سے مرحوم کے بعد مسلمانوں کو وہی امیدیں ہیں جو سرسید کے بعد نواب محسن الملک کی ذات سے تھیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کے تمام اسلامی اخبار تمام اسلامی انجمنیں اور تمام ٹرسٹیان محمدن کالج بغیر کسی استثنا کے اس بات پر متفق ہو گئے کہ بجائے نواب مرحوم کے محمدن کالج اور محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا آنریری سکرٹری نواب وقار الملک بہادر انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین صاحب کو بنایا جائے اور یہ اتفاق اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ انتخاب قوم کے حق میں کالج کے حق میں اور اس کانفرنس کے حق میں خدا کی رحمت ثابت ہوگا۔ کیونکہ مخبر صادق علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ما راٰہُ المسلمون حسناً فھو عنداللہ حسن۔۔۔۔۔ یعنی جس بات کو تمام مسلمان بہتر سمجھیں وہی خدا کے نزدیک بھی بہتر ہے۔ نواب محسن الملک کی وفات اور اُن کے بعد نواب وقار الملک کی جانشینی پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے:۔

عید رمضاں آمد و ماہ رمضاں رفت — صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

صاحبو! اس ناگزیر تمہید کے بعد میں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ آج کا اجلاس جو ملک سندھ کے اس مشہور بندرگاہ میں منعقد ہوا ہے ہماری کانفرنس

کا اکیسواں اجلاس ہے لیکن جو خصوصیت کہ ملک سندھ کو اسلام کے ساتھ ہے اس کے لحاظ سے یہ ملک اس بات کا مستحق تھا کہ اہل اسلام کی کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس اس ملک میں ہوتا۔ عربی لٹریچر میں جس کثرت سے سندھ کا نام آتا ہے ہندوستان کے کسی دوسرے حصے کا نام نہیں آتا کیونکہ ہندوستان میں جس حصہ سے عرب کو سب سے پہلے واقفیت ہوئی وہ یہی ملک سندھ تھا۔ یہی وہ خطہ ہے جس کو سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے پہلی صدی ہجری کے اخیر میں فتح کرکے یہاں بنی امیہ کی سلطنت کا جھنڈا گاڑا اور گویا کہ مسلمان کشورکشاؤں کے لئے ہندوستان کی آئندہ فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔ یہی ملک ہے جہاں ہندوستان میں سب سے پہلے علمائے اسلام کے حلقۂ درس قائم ہوئے اور فتح کے بعد ایک صدی میں تمام خطہ محدثین و فقہا کی کثرت سے عراق و شام کا نمونہ بن گیا۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کو عرب اپنے اصلی وطن سے زیادہ عزیز سمجھنے لگے تھے۔ محمد بن قاسم کے حسن انتظام اور عمدگی قوانین کی وجہ سے یہ ملک نہ صرف ریگستان ہونے کے لحاظ سے بلکہ دین و مذہب، مذاق و عادات اور اوضاع و اطوار کی حیثیت سے بھی سرزمین عرب کی سچی تصویر بن گیا تھا اور جیسا کہ حال کے ایک مشہور مصنف نے لکھا ہے اس نوجوان فاتح کی چند روز کی حکمرانی نے جو گہرا اور پائدار نقش اہل سندھ کے دلوں پر جما دیا تھا ایسا نقش پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانسو برس میں بھی نہیں جما سکیں۔ مگر افسوس ہے کہ جو حال ہندوستان کے عام مسلمانوں کی غفلت اور بے پرواہی کا زمانۂ حال کی تعلیم کی طرف سے دیکھا جاتا ہے ویسا ہی بلکہ اس سے بہت زیادہ سندھ کے مسلمانوں کا حال نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائے قیام کانفرنس سے لے کر اب تک جس کو بیس اکیس برس کا عرصہ گذر چکا ہے کوئی تحریک ملک سندھ کی طرف سے کانفرنس کے مدعو کرنے کے لئے نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے سال گذشتہ میں آنریبل سردار محمد یعقوب خاں مرحوم نے اس باب میں سلسلہ جنبانی کی تھی اور ایک مختصر رپورٹ مسلمانان سندھ کی تعلیمی حالت کے متعلق قلمبند کرکے آنریری سکرٹری کانفرنس کے پاس

بھیجی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنی زندگی میں کانفرنس کو یہاں نہ بلا سکے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے معزز جانشین جناب آنریبل خان بہادر شیخ صادق علی وزیر حال ریاست خیرپور سندھ نے اس منصوبے کو جو سردار صاحب مرحوم نے باندھا تھا بہ سرپرستی ہز ہائنس میر صاحب خیرپور سندھ بوجہ احسن پورا کیا ہے جس کا نتیجہ اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

حضرات! اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اطلاع کے لئے سردار صاحب مرحوم کی مذکورہ بالا رپورٹ اور نیز بعض دیگر بہی خواہانِ قوم کے بیان کا خلاصہ نہایت مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے بیان کروں جس سے آپ سندھ کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔ مذکورہ بالا ذریعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آبادی بمقابلہ دیگر اقوام کے بہت زیادہ ہے۔ یعنی منجملہ ۳۲ لاکھ دس ہزار نو سو دس نفوس کے جو کہ سندھ میں آباد ہیں ۲۴ لاکھ ۶۴ ہزار ۴ سو ۸۹ یعنی تین چوتھائی سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں جب کہ یہ ملک آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا اُس وقت گیارہ سو برس سے زیادہ زمانہ اُس کو مسلمانوں کے تحت حکومت رہتے گذر چکا تھا۔ اب بھی تمام کاشتکار اور تمام جاگیردار مسلمان ہیں اور انگریزی عملداری سے پہلے تمام اراضی کے مالک مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہ تھی۔ البتہ اب مہاجنوں اور دیگر اقوام نے مختلف طریقوں سے زمین کا بہت سا حصہ حاصل کر لیا ہے لیکن اب بھی زمینداری کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں ہے، یعنی تین چوتھائی سے زیادہ زمین مزروعہ مسلمانوں کی ملکیت میں ہے۔ مگر باوجود ان تمام فوقیتوں کے جو سندھ کے مسلمانوں کو ابتک حاصل ہیں جب ان کا حال اس معیار سے دیکھا جاتا ہے جو آج کل قوموں کی پستی اور عروج کا معیار ہے تو نہایت مایوسی ہوتی ہے۔ تعلیم، تجارت، صنعت وحرفت اور سرکاری ملازمت یہی وہ چیزیں

ہیں جو کسی قوم کی ترقی یا تنزل کی خبر دیتی ہیں۔ مگر سندھ کے عام مسلمان ان میں سے ہر ایک
حیثیت کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں۔ اگرچہ اہل اسلام کی حالت تعلیم کے
لحاظ سے تمام ہندوستان میں بمقابلہ دیگر ابنائے وطن کے عموماً قابل افسوس ہے مگر سردار
صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ کسی صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اس قدر
ابتر نہ ہو گی جیسی کہ یہاں کے مسلمانوں کی حالت ہے۔ بی اے پاس مسلمانوں کی تعداد انھوں
نے بمقابلہ دو سو ہندو گریجویٹس کے تمام سندھ میں صرف دس لکھی ہے۔ مگر میں نے سنا
ہے کہ ان دس میں ایک آدھ کے سوا سب کراچی کے غیر سندھی باشندے ہیں جو تجارت
کی غرض سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹری، سائنس
اور انجنیرنگ میں بمقابلہ ۲۰ ہندوؤں کے صرف ایک مسلمان ڈگری یافتہ ہے۔ بیرسٹروں
اور ایل ایل۔ بی پلیڈر اس صوبہ میں دو سو سے زائد ہیں، جن میں مسلمان صرف بیس
ہیں۔ اور منجملہ ایک سو بیس طلبہ کے جو گزشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے
صرف ۱۲ مسلمان تھے۔ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کے مسلمانوں میں
صرف انگریزی تعلیم ہی کی کمی نہیں ہے بلکہ عربی، فارسی یہاں تک کہ سندھی زبان میں
بھی اُن کی تعلیم کا تقریباً ایسا ہی حال ہے۔ فیصدی ایک دو سے زیادہ نوشت و خواند
نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں نہ صرف انگریزی تعلیم کی ترقی ہے بلکہ
فارسی تعلیم بھی قدیم زمانے سے اُن میں چلی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت سرکاری
گویا ہندوؤں کا حصہ ہو گئی ہے سردار صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کے
سبب اُن کے ہاتھ سے ہر قسم کی سرکاری نوکریاں نکل گئی ہیں اور یہی حال پیشہ اور
صنعت و حرفت کا ہے۔ سندھ میں ایک ہندو صاحب سشن جج اور ایک اسسٹنٹ
جج ہیں مگر اس درجے کا کوئی عہدہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بیس سب
ججوں میں صرف ایک شخص مسلمان ہے اور محکمہ مال میں منجملہ بیس ڈپٹی کلکٹروں کے

صرف تین مسلمان ہیں اور باقی سب ہندو اور منجملہ ۷۲ تحصیلداروں کے صرف ۲۲ مسلمان اور باقی سب ہندو ہیں۔

۱۹۰۶ء میں صیغۂ اصلاح تمدن کے کسی ممبر نے دو مضمون سندھ کی تمدنی اور تعلیمی حالت پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے تھے جن میں ثابت کیا گیا تھا کہ سندھ کے مسلمانوں کی تمدنی اور تعلیمی حالت ہندوستان کے تمام صوبوں سے گئی گذری ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ زمانہ آہستہ آہستہ اہل سندھ کو ترقی کی طرف مائل کرتا جاتا ہے۔ اُن کو اپنی پستی اور تنزل کا احساس ہونے لگا ہے، گورنمنٹ بھی اُن کے معروضات پر زیادہ توجہ اور اُن کے حقوق پر زیادہ لحاظ فرمانے لگی ہے، کراچی کا اسلامی مدرسہ جو مرحوم خان بہادر حسن علی صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے ترقی کرتا جاتا ہے۔ خصوصاً جب سے کہ مسٹر لائنس اس مدرسے کے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں، اُس کے نتائج خاطر خواہ ظہور میں آرہے ہیں۔ لڑکانہ میں وہاں کے زمینداروں کی کوشش اور مسٹر بڑآئی۔سی۔ایس کلکٹر لڑکانہ کی خاص توجہ سے ایک مدرسہ جس میں انگریزی کی پانچویں جماعت تک تعلیم دیجاتی ہے قائم ہوگیا ہے جس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس بھی ہے۔ ۱۹۰۲ء میں جو مسٹر علی محمد خاں دہلوی بیرسٹرایٹ لا کی کوشش سے لوکل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا تھا اُس کے نتائج خاطر خواہ ظہور میں آئے ہیں۔ گورنمنٹ نے کانفرنس کی کارروائی پر نہایت شفقت آمیز رزولیوشن پاس کیا اور ایک کمیٹی موسوم بہ محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی مقرر فرمائی جس کی تجویز سے ایک چھوٹا سا رزیڈنشل مدرسہ ضلع حیدرآباد کے شمال میں کھولا گیا اور جیساکہ سردار صاحب مرحوم کی رپورٹ میں درج ہے دوسرا مدرسہ ضلع حیدرآباد کے جنوب میں کھلنے والا تھا اور تیسرا کلرک آباد میں اور چوتھا ان سب مدرسوں کی نسبت بڑے پیمانے پر ضلع تھار اور پارکر کے مقام بتیار میں جس کی عمارت تیار ہوچکی ہے، جاری ہونے والا ہے۔ پانچواں سکھر میں کھولا جانا تجویز ہوا ہے جس کا کچھ سرمایہ

جمع بھی ہو گیا ہے اور جس کی عمارت کے واسطے زمین لے لی گئی ہے۔ اسی طرح سندھ کے کل اضلاع میں ایک ایک مدرسہ جاری کرنے کا سامان ہو چکا ہے اور خاص کر حیدر آباد میں دو مدرسے قائم کرنے کا ارادہ ہے۔ مگر سردار صاحب مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مجوزہ مدارس کے لئے روپیہ کی بہت ضرورت ہے۔ صرف مدرسہ کراچی کا بورڈنگ ہاؤس بڑھانے کے لئے جس میں زیادہ طلبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی پچاس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے جس میں سے چھ ہزار روپیہ ریاست خیر پور نے عطا کیا ہے اور بیس ہزار روپیہ عام مسلمانوں کے چندہ سے وصول کیا گیا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ سندھ کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم سے مستفید ہونے کا خیال شروع ہو گیا ہے اور قدیم تعصبات جو انگریزی تعلیم سے مانع آتے تھے سندھ میں بھی مثل اور صوبوں کے روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ اور صوبوں کی طرح یہاں بھی بغیر امدادی وظائف کے مسلمانوں کا تعلیم پانا نہایت دشوار ہے۔ جو لوگ تعلیم پانے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ تعلیم سے بھاگتے ہیں اور جو تعلیم کے خواہاں ہیں وہ استطاعت نہیں رکھتے۔ اگرچہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے گورنمنٹ اُن کی تعلیم کی طرف نہایت متوجہ پائی جاتی ہے اور ریاست خیر پور سے بھی اُن کو بہت کچھ امداد کی توقع ہے لیکن پھر بھی سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کا پھیلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس قوم کی حالت تعلیم سے اس قدر بعید ہو کہ اپنی مادری زبان میں بھی نوشت و خواند کرنے والے نہایت کمیاب ہوں اُن کو انگریزی تعلیم سے مانوس کرنا ایک نہایت دشوار گذار مرحلہ ہے۔ جب تک قوم میں ایسے بہت سے جوانمرد صاحب استقلال اور قوم کے ہمدرد پیدا نہ ہوں گے جیسے کہ مرحوم خان بہادر حسن علی بانیٔ مدرسہ کراچی تھے یا جیسے مسٹر دہلوی بیرسٹر ایٹ لا اب موجود ہیں اُس وقت تک صرف گورنمنٹ کی

توجہ اور ہز ہائنس میر خیرپور سندھ کی امداد سے کام نہیں چل سکتا

سر سید احمد خاں مرحوم نے جب علیگڈھ میں محمدن اینگلو اورنٹیل کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا سب سے پہلے اُنھوں نے اس بات کے دریافت کرنے کے لئے کہ مسلمان کیوں اپنی اولاد کو سرکاری مدارس میں تعلیم کے لئے نہیں بھیجتے، ایک انعامی اشتہار جاری کیا تھا تاکہ بہت سے لائق آدمی اس مضمون پر اپنی اپنی رائے ظاہر کریں۔ چنانچہ (۳۲) مضمون مختلف لوگوں کے اُن کے پاس پہنچے جن کا ماحصل یہ تھا کہ سرکاری طریقۂ تعلیم جس کو سرکار کسی خاص فرقہ کی حالت کے موافق بدل نہیں سکتی مسلمانوں کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہے اور مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لئے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کی فکر آپ کریں۔

صاحبو! میں سمجھتا ہوں کہ جو مشکلات سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کی سدراہ ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جو گورنمنٹ کی توجہ سے رفع ہو سکتی ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں کہ جب تک خود قوم کے لیڈر اُن کے حل کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوں، ہرگز رفع نہیں ہو سکتیں۔ یہاں میں چند مشکلات کا جو معتبر ذریعوں سے مجھے معلوم ہوئے ہیں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اوّلاً سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کے عام نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اب تک لوکل سس فنڈ سے ابتدائی مدارس زیادہ تر ایسے مقامات میں قائم ہوتے رہے ہیں جہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے اور مسلمان آسانی سے وہاں اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے نہیں بھیج سکتے۔ اس کے سوا مدارس میں اُستاد اکثر ہندو ہیں جن کی نسبت یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ اُن کا برتاؤ مسلمان طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ جیسا کہ اُستادوں کا برتاؤ شاگردوں کے ساتھ ہونا چاہئے نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شکایت کہاں تک صحیح ہے لیکن

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کی اولاد کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اُن کی تعلیم کے لئے زیادہ تر مسلمان اُستاد مقرر کئے جائیں۔ دلّی میں انگریزی تعلیم مدت دراز سے جاری تھی مگر ۱۸۵۷ء سے پہلے وہاں کے مسلمان تعلیم سے ہمیشہ متنفر رہے حالانکہ وہاں کے ایک مسلمان نواب نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ اہل دہلی کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ کے سپرد اس لئے کیا تھا کہ اُس کے منافع سے دہلی کے طلبہ کو وظائف دئے جایا کریں، باوجود اس کے کہ فنڈ سے مسلمانوں نے بہت ہی کم فائدہ اُٹھایا۔ لیکن غدر کے بعد گورنمنٹ نے اس فنڈ کی آمدنی سے ایک علیحدہ مدرسہ بنام اینگلو عربک اسکول خاص مسلمانوں کے لئے قائم کر دیا اور اُس میں یہ شرط لگا دی کہ یہاں کل استاد مسلمان رکھے جائیں۔ اس تدبیر سے چند روز میں دہلی کے مسلمان یک قلم تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئے، یہاں تک کہ ایک عرصہ کے بعد مدرسہ مذکور مڈل اسکول سے ہائی اسکول بنا دیا گیا۔ اس وقت دہلی میں جس قدر گریجویٹ، انڈر گریجویٹ اور انٹرنس پاس مسلمان پائے جاتے ہیں، سب اسی مدرسہ سے ابتدائی تعلیم پاکر نکلے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں سب سے بڑی اور بدیہی مثال ایم۔ اے او کالج علیگڈھ ہے، جہاں ابتدائی تعلیم زیادہ تر مسلمان اُستاد دیتے ہیں۔ پس سب سے پہلے یہاں کے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ مجوزہ مدارس جو سندھ میں ہر ایک ضلع میں قائم ہونے قرار پائے ہیں جہاں تک ممکن ہو وہ ایسے مقامات میں قائم کئے جائیں جہاں مسلمانوں کی اولاد آسانی سے تعلیم کے لئے جا سکے اور گورنمنٹ سے درخواست کیجائے کہ اُن مدرسوں میں ہندو اور مسلمان اُستاد اُسی نسبت سے مقرر کئے جائیں جس نسبت سے کہ ہندو اور مسلمان طلبہ اُن میں داخل ہوں۔ اول اول سندھ میں مسلمان اُستاد بلا شبہ مشکل سے مل سکیں گے لیکن موجودہ حالت میں علیگڈھ کالج یا لاہور کے اسلامیہ کالج سے کسی قدر زیادہ تنخواہ

پر بلائے جاسکتے ہیں۔ جس طرح مسلمان استادوں کے مقرر کرنے کی ضرورت ہے اُسی طرح معائنہ کرنے والے افسروں میں بھی مسلمانوں کا ہونا کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

دوسری مشکل جو مسلمانوں کی تعلیم میں درپیش ہے وہ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا نہ ہونا ہے اور یہ ایسی مشکل ہے جس کا حل کرنا خود ہمارے ہاتھ میں ہے نہ کہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں کیونکہ گورنمنٹ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہندوستان کی بے شمار قوموں میں سے کسی خاص قوم کی مذہبی تعلیم یہاں تک کہ عیسائی مذہب کی تعلیم بھی اپنے مدارس میں جاری نہیں کرسکتی۔ پس ضرور ہے کہ جو ابتدائی مدارس سندھ کے اضلاع میں قائم کئے جائیں اُن میں مذہبی تعلیم کا انتظام خود قوم کی طرف سے کیا جائے۔ میں سنتا ہوں کہ سندھ میں جس طرح دنیوی تعلیم مفقود ہے اسی طرح مذہبی تعلیم کی طرف سے بھی یہاں انتہا درجہ کی غفلت اور بے پرواہی پائی جاتی ہے۔ مجھے میرے ایک ثقہ دوست نے بیان کیا کہ سندھ میں ایک موقع پر تین نوجوان مسلمان موجود تھے۔ میں نے اسلامی روایات سے اُن کی حد سے زیادہ ناواقفیت دیکھی تو امتحاناً اُن سے یہ سوال کیا کہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہارا نبی کون ہے؟ ایک نے کہا: امام حسین (چیرز) دوسرے نے کہا: فیض محمد خاں میر خیرپور (چیرز) اور تیسرے نے کہا: پیر پگھارا (چیرز)۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سندھ میں مذہبی تعلیم کا کیا حال ہے۔ جو لوگ کراچی یا حیدرآباد میں رہتے ہیں وہ اس حکایت کو سن کر بلاشبہ تعجب کریں گے مگر جو لوگ دیہات کی حالت سے خبردار ہیں ان کو اس سے کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا۔

تیسری مشکل اور سب سے بڑی اور سخت مشکل وظائف کے لئے سرمایہ مہیا کرنا اور قوم کے ہونہار بے استطاعت لڑکوں کو امدادی وظائف دے کر مختلف مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم کے لئے بھیجنا ہے۔ بالفعل کراچی کا اسلامیہ اسکول اور لاڑکانہ کا مدرسہ اور حیدرآباد و سکھر وغیرہ کے مجوزہ مدارس بشرطیکہ وہ بہمہ وجوہ مکمل ہوجائیں سکنڈری

تعلیم تک کافی ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کراچی میں گورنمنٹ کالج موجود ہے اور اگر کافی امداد طلبہ کو دی جائے تو لاہور کے اسلامیہ کالج اور علیگڈھ کے محمڈن کالج میں بھی اُن کو بھیجا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ اُن سے تعلیم کے لئے چندہ وصول کرنا نہایت مشکل ہے مگر تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ اگر چندہ وصول کرنے والے موجود ہوں تو چندہ دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ چندہ مانگنے والے جس قدر زیادہ ذی وجاہت، زیادہ ذی رتبہ اور زیادہ اعتبار والے ہوں گے، اُسی قدر چندہ فراہم کرنے میں زیادہ کامیابی ہوگی۔ پس جبتک کہ قوم کے ممتاز لوگ اس کام کے لئے کھڑے نہ ہوں گے اور جب تک کہ وہ قوم کے لئے گداگری کرنے کو بجائے ننگ و عار سمجھنے کے ذریعۂ فخر و مباہات نہ سمجھیں گے روپیہ تحصیل کرنا سخت مشکل ہے۔ تعلیم روز بروز گراں ہوتی جاتی ہے اور بے مقدور لوگوں کے لئے جو سب سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہیں، اُس کا میدان تنگ ہوتا جاتا ہے۔ پس نہایت ضرورت اس بات کی ہے کہ یا تو ذی مقدور لوگوں میں ایسے بہت سے عالی ہمت اشخاص پیدا ہوں جو اپنی دولت کا ایک حصہ قوم کی تعلیم میں صرف کریں اور اپنی ہموطن قوموں کے اہل ہمت سے سبق حاصل کریں جو لاکھوں روپیہ اور لاکھوں کی جائداد قوم کی بھلائی کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ یا چند جوانمرد کمر ہمت باندھ کر اور جھولی گلے میں ڈال کر کھڑے ہو جائیں اور قوم کے بچوں کے لئے گداگری اختیار کریں۔ سرسید کی کامیابی کا بھید زیادہ تر اسی گداگری میں چھپا ہوا ہے۔ ان کے ایک دوست کے پوتا پیدا ہوا تھا۔ اُن سے پوتے کے ہونے کی خواہش میں چراغی کے پانچ روپے طلب کئے جس پر اُن کے دوست نے ایک معقول رقم چراغی کے نام سے نذر کی۔ ایک اور دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علیگڈھ میں آئے۔ آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لئے پہنچے۔ وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آئے۔ نمائش گاہ

علیگڈھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کو دُکان پر بیٹھے نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی، چینی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور خود اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔ انھوں نے چندہ مانگنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں کس سے مانگتا ہوں اور کس طرح مانگتا ہوں۔

صاحبو! آپ کے سامنے اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دنیا میں تعلیم نے کیسا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ قوموں میں وہی نسبت نظر آتی ہے جو آدمی اور جانوروں میں ہونی چاہئے۔ جو قومیں غفلت یا تعصب سے ابتدا میں مغربی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں وہ اپنی نادانی پر کف افسوس ملتی ہیں اور گو ترقی کا موقع اُن کے ہاتھ سے اب بہت دور جا پڑا ہے مگر چار و ناچار اُن کو بھی آخر کار اُسی مغربی تعلیم کے سایہ میں پناہ لینی پڑی ہے جس کے نام سے وہ سو سو کوس دور بھاگتی تھیں۔ خصوصاً مسلمان جو سب سے زیادہ تعلیم کے مخالف تھے اُن کی بھی اب بہت دیر کے بعد آنکھیں کھُلی ہیں اور انھوں نے بھی اُس مسافر کی طرح جو قافلے سے بچھڑ کر بہت پیچھے رہ گیا ہو نہایت پشیمانی کے ساتھ اُفتاں و خیزاں قافلے کے پیچھے دوڑنا شروع کیا ہے۔ مصر، ترکی، ایران اور افغانستان میں تعلیم کا خیال روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے وہاں کے مسلمانوں نے بھی اپنی قومی ہستی ترقی تعلیم پر منحصر سمجھی ہے چنانچہ روس کے ذی مقدور مسلمان اپنے عطیات سے اور متوسط الحال لوگ قومی چندوں کے ذریعہ سے اپنے ملک کے اہل اسلام میں تعلیم پھیلا رہے ہیں۔ جو لیکچر روس کے مشہور اسلامی اخبار "ترجمان" کے ایڈیٹر نے یکم نومبر سنہ حال کو قاہرہ میں دیا تھا اُس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ "اخیر چوتھائی صدی میں روس کے مسلمانوں میں ترقی کے خیالات کثرت سے پھیلنے لگے ہیں۔ انھیں خیالات کا اثر ہے کہ اخیر زمانے میں اُن کی توجہ مدارس کی اصلاح پر مائل ہوئی ہے اور وہ مفید کتابیں علوم جدیدہ اور ترکی لٹریچر کی شائع

کرنے لگے ہیں اور جدید طرز کے مدارس کھولتے جاتے ہیں اور انھوں نے علوم جدیدہ اور علوم عربیہ وادبیہ کی تحصیل کے لئے اپنے طلبہ کو روس کے مدارس عالیہ اور یورپ، ٹرکی اور مصر کے مدارس میں بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ ابتدائی اسلامی مدارس جن کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہوگئی ہے تعداد میں ایک ہزار کے قریب ہیں۔ مذہبی مدارس میں سے جن کی اصلاح ہو چکی ہے، ایک مدرسہ کازان میں، ایک اورن برگ میں اور ایک اوفا میں ہے۔ ان مدرسوں میں ریاضیات، طبیعیات، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم دیجاتی ہے اور علوم عربیہ اور علوم دینیہ کی کتابیں بھی حسب معمول پڑھائی جاتی ہیں"

اس کے بعد انھوں نے بیان کیا کہ "حسن اتفاق سے روسی مسلمانوں میں ایسے فیاض دولتمند پیدا ہوگئے جنھوں نے اپنی دولت، علم کی اشاعت اور قوم کی اصلاح و ترقی میں بے دریغ صرف کی۔ اُن میں سے خاص کر ذکر کرنے کے لائق مرحوم حاجی نعمت اللہ قراشیف ہیں جنھوں نے ایک سو مدرسوں اور ایک سو مسجدوں کی اپنے روپئے سے بنیاد ڈالی اور ایک عالیشان کتب خانہ قائم کیا جس میں نہایت عمدہ اور نادر کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ کازان کے نامور مسلمان تاجر مرحوم احمد حسینی نے بھی مدرسوں کی بنیاد ڈالنے اور علوم جدیدہ کے پھیلانے میں تین لاکھ روبل (یعنی سات لاکھ ساڑھے بارہ ہزار روپیہ) صرف کیا۔ مرحوم احمد حسینی کے بھائی عبدالغنی حسینی نے بھی دو سو ابتدائی اسکول نئے طریقۂ تعلیم کے قائم کئے اور اسکولوں کی اصلاح کے خیالات کو انھوں نے روس کے اندرونی صوبوں ہی میں نہیں بلکہ اُن دور و دراز صوبوں میں بھی پھیلایا ہے جو چین کی آسمانی سلطنت کی حدود پر واقع ہیں"

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "منجملہ ان فیاض دولتمند مسلمانوں کے ایک حاجی زین العابدین ناقیف ہیں جو باکو کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے علم کو پھیلانے اور

محتاج اور غریب مسلمانوں کی امداد کرنے میں سب سے زیادہ کوشش کی ہے۔ اس فیاض شخص نے داغستان میں ایک سو مسجدیں اور ایک سو ابتدائی مدرسے قائم کئے۔ باکو کے نواح میں عام زراعت کے جدید اصولوں کے مطابق ایک وسیع خطۂ زمین بطور نمونے کے مخصوص کیا تاکہ جدید طریقۂ کاشتکاری کو مسلمان سیکھیں اور اس کی تقلید کریں۔ روسی زبان اور ترکی زبان میں کئی اخبار شائع کرائے جن سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ روس کے حقوق کی حفاظت کیجائے اور مسلمانوں کے ملکی اور سیاسی خیالات کا اُن کے ذریعہ سے اظہار کیا جائے۔ اس کے سوا انھوں نے لاکھوں روپیہ یورپ اور روس کی یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کو تعلیم دلانے میں صرف کیا۔ روس میں جو آج کل نامور مسلمان ڈاکٹر، وکیل اور انجنیر ہیں وہ سب اس فیاض دولتمند مسلمان کے شرمندۂ احسان ہیں۔ انھوں نے مسلمان لڑکیوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ باکو میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جس عالیشان مدرسہ کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے صرف اس کی تعمیر پر تین لاکھ یا بیس ہزار پونڈ کی رقم صرف ہوئی ہے۔ اسی مدرسہ کے اخراجات کے لئے انھوں نے ایک جائداد وقف کی ہے جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار پونڈ یا ساڑھے چار لاکھ روپیہ ہے"

اس کے بعد انھوں نے مسلمانانِ مصر کو مخاطب کر کے کہا کہ "اے معزز و محترم مسلمانانِ مصر! آپ لوگ ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ خداوند عالم اس فیاض ہمدرد قوم کو مدت دراز تک زندہ و سلامت رکھے" پھر کہا "ایسے مسلمان دولتمند جنھوں نے ایک یا دو ابتدائی یا متوسط درجہ کے مدرسے روس میں قائم کئے اُن کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہے کہ میں اُن کا کوئی شمار نہیں بتا سکتا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہم روس کے مسلمانوں نے ترقی کے میدان میں جو قدم بڑھایا ہے وہ انھیں مدرسوں کی بدولت ہے"

صاحبو! اس فاضل لیکچرار کے بیان میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ اُس نے

اپنے طویل لیکچر میں جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے گئے ہیں کہیں ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے پایا جائے کہ روس کے مسلمانوں کے ان پرائیویٹ اسکولوں میں گورنمنٹ روس نے بھی کچھ امداد دی ہے یا نہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے صاف صاف اس بات کا اظہار کیا ہے کہ روس کے مسلمانوں نے جو کچھ تعلیم میں اب تک ترقی کی ہے وہ محض اپنی قوم کی امداد سے کی ہے ۔ظاہر ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی رعایا کا حال اس باب میں گورنمنٹ روس کی رعایا سے بالکل مختلف ہے ۔ یہاں گورنمنٹ ان قوموں کو جو تعلیم میں اپنے دیگر ہموطنوں سے نہایت پست حالت میں ہیں طرح طرح سے تعلیم کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے اُن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا کرتی ہے اور اُن کے پرائیویٹ اسکولوں میں امداد دیتی ہے اور اگر اُن کی کوشش سے کوئی بڑا قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہوتا ہے تو اُس کی خود سرپرست بنتی ہے ۔ پس ہم مسلمانوں کو بمقابلہ روس کے مسلمانوں کے تعلیم میں ترقی کرنا نہایت آسان ہے بشرطیکہ ہم اپنی تعلیم کا دارو مدار محض گورنمنٹ کی امداد پر نہ رکھیں ، بلکہ گورنمنٹ کو رفتہ رفتہ اپنی تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش کرتے جائیں۔ گورنمنٹ کا کام صرف اس قدر ہے کہ رعایا میں تعلیم کا مذاق اور اُس کی ضرورت کا احساس پیدا کردے ۔ اس کے بعد یہ کام خود رعایا کا ہے کہ وہ آگے قدم بڑھائے اور جو پود گورنمنٹ نے اپنے پُرزور ہاتھ سے لگادی ہے اُس کو اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے پروان چڑھائے اور ملک اور قوم کو اُس سے فائدہ پہنچائے ۔

صاحبو! سندھ کے مسلمانوں کی حالت نہایت افسوسناک ہے ۔ آج کل تمام ترقیات کا مدار محض تعلیم پر ہے ۔جب سندھ میں تعلیم ہی نہیں تو جاننا چاہئے کہ کچھ بھی نہیں ۔جو لوگ زمینداری پر نازاں ہیں، اگر انھوں نے تعلیم کی طرف توجہ نہ کی تو زمینداری کوئی دن کی مہمان ہے کیونکہ جو لوگ ملک میں تعلیم یافتہ ہیں وہ رفتہ رفتہ اُن کی زمینوں پر قابض ہوتے جاتے ہیں اور جس طرح سرکاری ملازمت سے مسلمان خارج ہوگئے ہیں اسی طرح

زمینداری سے بھی آخر کار اُن کو دست بردار ہونا پڑے گا جس طرح بدنِ انسان میں خون کی کمی تمام بیماریوں کی جڑ ہے اسی طرح تعلیم کی کمی تمام قومی مصائب کی جڑ ہے۔ بغیر تعلیم کے اب دنیا میں عزت سے رہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس وقت دور دور سے مسلمان اسی غرض سے کراچی میں آئے ہوئے ہیں کہ سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ ہز ہائنس میر صاحب خیرپور اور اُن کے روشن ضمیر وزیر نے ان کو اسی لئے مدعو کیا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کریں اور ایسی تجویزیں پیش کریں جن سے اُن کی تعلیم میں آسانیاں پیدا ہوں، سرکاری افسر تہ دل سے ترقی تعلیم مسلمانان سندھ کی حمایت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر جائلز ڈائرکٹر جنرل تعلیمات ہند جو پہلے ایک مدت تک اس صوبہ میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم رہ چکے ہیں وہ بھی عنقریب تشریف لانے والے ہیں اور امید ہے کہ اپنی تشریف آوری سے اس کانفرنس کو عزت بخشیں گے۔ اب وقت ہے کہ سندھ کے مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور اُن کی ترغیب کے جو اسباب اس وقت جمع ہوگئے ہیں اُن کو غنیمت سمجھیں اور اُن سے فائدہ اٹھائیں۔

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو!
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانوگے۔ تو پچتاؤگے نادانو!
میری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو!
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے میری چالوں سے بیگانو!
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے
بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو!
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنر یہاں عیش کرتے تھے

ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل میری جانو!
نصیحت میری مانو۔ اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون۔ تم بھی پھر جاؤ
گیا دورہ حکومت کا۔ بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے۔ رہے معلوم یہ ان کو
کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن او صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئے گی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت
جنھیں پائیں گے آقا زیور تعلیم سے عاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز
نہ فصادی ۔ نہ جراحی ۔ نہ کحالی ۔ نہ عطاری
جہاں تک دیکھئے ۔ تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے
گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انساں کا ایک زیور
ہوئی ہے زندگی اب منحصر خود علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا
نہ زرگر اور نہ آہن گر نہ بازی گر نہ سوداگر

مہندس چاہیئے مزدور اب اور راج اقلیدس
بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور
گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے
برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا
جو آج ایک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اُس سے اعلیٰ تر
نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں
دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر
زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے۔ نام اُن کا مٹا دوں گا

صاحبو! یہاں تک جو کچھ آپ کے سامنے بیان کیا گیا وہ خاص کر سندھ کی موجودہ تعلیمی حالت سے علاقہ رکھتا تھا۔ اب میں چند الفاظ عام مسلمانان ہند کی تعلیم کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں اگرچہ اس کے متعلق پہلے اس قدر کہا جا چکا ہے کہ میں کوئی بات اس سے زیادہ نہیں بیان کر سکتا۔

سرسید مرحوم جنہوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد ڈالی ہے ابتدا سے اُن کا خیال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت یہ تھا کہ جب وہ تعلیم پا کر کالجوں سے نکلیں گے تو ان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ جو ذریعۂ معاش وہ اپنی طبیعت کے مناسب اور اپنی حالت کے موافق دیکھیں گے۔ اس کو خود اختیار کر لیں گے۔ کیونکہ تعلیم اُن کی خود رہنمائی کرے گی اور اُن کو اُسی رستے پر ڈال دے گی جس کی قابلیت اُن کی فطرت میں موجود ہو گی۔ پس یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کے سوا اُن کو کسی خاص پیشے یا صنعت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جہاں تک دیکھا جاتا ہے، ابتک

اس خیال کا ظہور نہیں ہوا اور جو امیدیں اُن سے کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ تعلیم کے زمانے میں ہر مسلمان نوجوان محض سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت ہی کو اپنی منزلِ مقصود جانتا ہے اور تعلیم کے بعد اسی کی تلاش میں دائیں بائیں ہاتھ مارتا پھرتا ہے اور اگر حسبِ دلخواہ اُس کو ملازمت نہیں ملتی تو یہ خیال کرتا ہے کہ تعلیم میں جو کوشش اور محنت کی گئی تھی وہ سب رائگاں گئی۔ ڈاکٹری یا انجینری بھی وہ ملازمت کی غرض سے سیکھتا ہے۔ صرف قانون ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے ذریعہ سے معدودے چند مسلمان جب تک کہ اُن کو کوئی سرکاری عہدہ نہیں ملتا، البتہ کسی قدر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے سوا کسی آزاد پیشے کے اختیار کرنے کی اُن میں جرأت نہیں پائی جاتی۔

سرسید مرحوم نے اپنے خیال کی تائید میں ایک موقع پر یہ حکایت لکھی ہے کہ " ایک دہقان کے بیٹے نے بہت اضطراب کے ساتھ اپنے باپ سے کہا کہ گاؤں کے تالاب میں پانی چلا آتا ہے، جب تالاب بھر جائے گا تو پانی کہاں جائے گا۔ اُس کے باپ نے کہا: بیٹا اندیشہ مت کر۔ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی اپنے نکاس کا رستہ آپ نکال لے گا " اس حکایت کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ " یہی حال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے۔ ابھی اُن کی ایسی قلت ہے کہ وہ کوئی رستہ آئندہ زندگی کے لئے نہیں نکال سکتے۔ جب وہ کثرت سے ہوں گے تو کوئی رستہ نکال لیں گے۔ رستوں کی کمی نہیں ہے، مگر ابھی تالاب بھرا نہیں ہے ،، لیکن اے صاحبو! جس رفتار سے مسلمانوں میں تعلیم چل رہی ہے، اُس رفتار سے تالاب کے بھرنے میں بہت دیر معلوم ہوتی ہے، مگر رستہ نکالنے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو تالاب کے بھر جانے کے بعد بھی خاصکر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ ملازمت کے سوا کوئی دوسرا رستہ آئندہ زندگی کے لئے نکال سکیں۔ ہندوستان کے اس خاص حصے میں جس میں کہ لکھنؤ، آگرہ، دہلی اور لاہور کے قدیم دارالحکومت شامل ہیں، زیادہ تر عرب، ایران

اور ترکستان وغیرہ کی نسلیں آباد ہیں جن کے آبا و اجداد ہمیشہ یا تو خدمات سلطانی پر مامور رہے یا معافیات وجاگیرات کے بھروسے پر اُن کو کسی قسم کے آزاد پیشے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ قانون وراثت طبیعی کے موافق رفتہ رفتہ تجارت اور صنعت وغیرہ قابلیت اُن کی نسلوں میں بالکل مفقود ہوگئی اور آزاد پیشوں کی جرأت کرنے کا ان میں بالکل حوصلہ باقی نہیں رہا۔ اُن کی یہ خاصیت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ نہ تعلیم سے اُن میں حس وحرکت پیدا ہوتی ہے نہ اپنی ہموطن قوموں کی کاروباری زندگی دیکھ کر اُن کی ریس کرنے کا خیال اُن میں پیدا ہوتا ہے اور نہ یورپ کی عالمگیر تجارت وصنعت کا سیلاب اُن کی آنکھیں کھولتا ہے۔ اول اول جو مسلمان شرفا دستکاری یا دکانداری کو اپنی شان کے خلاف جانتے تھے وہ خیال بھی روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے لیکن اُن کی جھجک جو آزاد پیشوں کی طرف سے اُن کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے وہ کسی طرح نہیں جاتی۔ بعض تعلیم یافتہ نوجوان جو بڑی جرأت کر کے کوئی کام شروع کرتے ہیں تو اکثر بسبب ناتجربہ کاری اور عدم واقفیت کے اُس میں کامیاب نہیں ہوتے اور آخرکار کسی قدر نقصان اٹھا کر اس سے دست بردار ہوجاتے ہیں اور جب اُس کے دیگر ہم چشم جو کاروباری دنیا میں قدم رکھنا چاہتے تھے اپنی آنکھ سے اُن کی ناکامی دیکھتے ہیں تو اُن کے حوصلے بھی پست ہوجاتے ہیں اور اُن کو بھی ہمیشہ کے لئے اپنی آزادی سے دست بردار ہونا اور وہی غلامی یعنی ملازمت کا طوق گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

یہ حالت تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی نہایت مایوس کرنے والی اور تعلیم اولاد سے مسلمانوں کا دل اچاٹ کرنے والی ہے۔ اب تک ہندوستان کے مسلمانوں میں جس قدر تعلیم کا خیال پیدا ہوا ہے اُس کی بنیاد صرف اس بات پر ہے کہ وہ تعلیم کو ایک ذریعہ حصول معاش کا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب اُن کی اولاد تعلیم پانے کے بعد معاش کی طرف سے فارغ البال نہ ہوگی تو سوائے اس کے کہ وہ تعلیم کا خیال چھوڑ دیں اُس کا اور کیا

انجام ہوسکتا ہے۔ سرکاری ملازمتیں نہایت محدود ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ پس ممکن نہیں کہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان کے لئے حسب دلخواہ سرکاری ملازمت مل سکے۔ البتہ صنعت و حرفت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس قدر تعلیم یافتہ لوگ بڑھتے جائیں گے اسی قدر اُن کی مانگ زیادہ ہوتی جائے گی۔

یورپ کے ایک روشن خیال مصنف کا قول ہے کہ جس ملک یا قوم کا دارومدار ملازمت پر ہوتا ہے وہ کبھی مرفہ الحال نہیں ہوسکتی۔ اُن کی قدرتی قوتیں ہمیشہ پژمردہ رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ بالکل فنا ہوجاتی ہیں۔ لیکن جہاں صنعتوں اور حرفتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے وہاں یہ سمجھنا چاہیئے کہ قومی زندگی کی بنیاد پڑگئی ہے اور وہ زمانہ قریب ہے کہ تازگی اور رونق تمام ملک پر چھا جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ یورپ کے جن شہروں میں لوگ ملازمت کرنے کے عادی ہیں وہاں تمام کوچوں اور بازاروں پر ہر وقت افسردگی اور اداسی برستی ہے۔ لیکن جہاں صنعت و حرفت کا بازار گرم ہے وہاں پر ہر شخص کے چہرے پر شگفتگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔

صاجو! صنعت و حرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کیجاتی ہے جب سے سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے ہمارے معزز ہموطن اُس کی طرف بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ اُس ملک کی مالی مشکلات جس میں وہ اکثر مبتلا ہوتا رہتا ہے، اُن سے نجات پانا محض صنعت و حرفت کی ترقی پر منحصر ہے۔ ممالک متحدہ میں اسی مقصد کے لئے انڈسٹریل کانفرنس قائم کی گئی ہے۔ اور صوبوں میں بھی اس طرف توجہ ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ مسلمان بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ ابتک اُس سے بالکل الگ رہے ہیں اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنی تمام ہموطن قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اب کسی طرح اُن کی برابری نہیں کرسکتے اسی طرح صنعت و حرفت سے بھی اس وقت تک

اُن کی غفلت کا وہی انجام نہ ہو۔ میں صنعت وحرفت کی تعلیم کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اُسی کو دہراتا ہوں اور قوم کے لیڈروں کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی طرف متوجہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہر سال ہر درجہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے اُن کی حیثیت کے موافق کسی قدر معقول وظیفے دئے جایا کریں تو امید ہے کہ چند سال میں ایسے کثیر التعداد نوجوان پیدا ہو جائیں گے جو اپنے سچیثموں کو آزاد پیشوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت دلا سکیں گے۔ اور اگر قوم کے دولتمندوں کو خدا ایسی توفیق دے کہ وہ بی۔ اے پاس نوجوانوں کو وقتاً فوقتاً صنعت وحرفت کی تعلیم کے لئے معقول وظیفے دیکر یورپ یا جاپان بھیجتے رہیں تو امید ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہماری قوم کے دن پھر جائیں گے۔ جس زمانے میں سرسید مرحوم نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ولایت بھیجنے کے لئے سول سروس فنڈ کے نام سے سرمایہ جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ لوگ قومی ہمدردی کے نام سے بالکل بے خبر تھے اور اسی لئے اُس وقت سرسید کو اس منصوبے میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر اب ہماری قوم کے دولتمندوں میں روز بروز ایسی مثالیں قائم ہوتی جاتی ہیں کہ اگر کوئی ایسا فنڈ قائم کیا جائے جس کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی تعلیم کے لئے غیر ملکوں میں بھیجا جائے تو اس مقصد میں کامیابی ہونی ناممکن نہیں ہے۔

جس طرح صنعت وحرفت کی تعلیم کا قوم میں پھیلنا ضروری ہے اسی قدر بلکہ اس سے بہت زیادہ ہمارے نوجوانوں کو نئے طریقۂ زراعت کی تعلیم دلانی ضروری ہے خصوصاً ایسے صوبے میں جیسا کہ سندھ ہے اور جہاں اسّی فیصدی کے قریب مسلمان کاشتکار اور زمیندار ہیں، بجائے صنعت وحرفت کے زراعتی اسکولوں میں تعلیم دلانا زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ جو لوگ زراعتی اسکولوں سے تعلیم پاکر نکلیں وہ زراعت کے عمدہ عمدہ فارم قائم کر کے

عملی طور پر اپنے بھائیوں کو دکھائیں کہ زمانۂ حال میں زراعت نے کس قدر ترقی کی ہے کہ جس زمین سے قدیم طریقہ کے موافق مثلاً پانچ روپیہ بگیہ منافع ہو سکتا تھا اب نئے طریقہ سے کم و بیش دس روپیہ منافع بہ آسانی ہو سکتا ہے۔

بہرحال مسلمانوں کی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر شعبہ میں دستگاہ حاصل کریں اور اُس دوڑ میں جس میں اُن کے ہموطن اُن سے بہت دور آگے نکل گئے ہیں جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ وہ زمانہ قریب ہے کہ اُن کو نہ صرف اپنی عزت اور توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا۔

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ہیں ان کو نگلے جاتے — دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں
سنبھلو! وگرنہ رہنا یہاں اس طرح پڑیگا — بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں

۱۰۔ سر سیّد مرحوم

(سر سید کی وفات کے بعد کئی سال تک حیدرآباد دکن میں ہر سال سر سید کی برسی کا جلسہ ہوتا رہا، جس میں مرحوم کی زندگی اور اُن کے کارناموں پر تقریریں ہوتیں اور مضمون پڑھے جاتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں حسنِ اتفاق سے مولانا حالی مرحوم حیدرآباد میں تشریف فرما تھے۔ برسی کے موقع پر اُن سے ایک مضمون پڑھنے کی درخواست کی گئی جسے انھوں نے بطیبِ خاطر قبول فرمایا۔ یہ وہی مضمون ہے اور اُس وقت رسالہ زمانہ (کانپور) میں شائع ہوا تھا۔)

جس رسم کے ادا کرنے کے لئے آج سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں یہ اُس شخص کی برسی کی تقریب ہے جس نے پچاس برس مسلسل ملک اور قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی خدمت گزاری میں بسر کئے اور باوجود سخت مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے اخیر دم تک اس کو پیش آتی رہیں وہ اپنے ارادوں میں نہایت استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ خود مسلمانوں نے جن کی خیر خواہی میں اس نے اپنی دو تہائی زندگی صرف کی، اُس کو کافر، ملحد، نیچری، دجّال سب کچھ کہا۔ اُس کے کفر پر سیکڑوں فتوے لکھائے گئے۔ اُس پر اور اُس کے کاموں پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی گئیں۔ اُس کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس کے برخلاف ملک کے ہر گوشے سے نئے نئے اخبار اور رسالے برابر جاری ہوتے رہے مگر اُس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور جو منصوبہ مسلمانوں کی بھلائی اور خیر اندیشی کا ابتدا سے باندھا تھا اس کو دمِ واپسیں تک پورا کرتا رہا۔ میری مراد اُس شخص سے سر سید احمد خاں مرحوم ہیں جن کی وفات کو آج پورے آٹھ برس گزرے ہیں۔

کیا خدا کی قدرت ہے کہ جس شخص کو چند روز پہلے کافر و ملحد کہا جاتا تھا اب ملک کے

اطراف وجوانب میں ہر سال اُس کی برسی کیجاتی ہے اور اُس کے احسانات جو اُس نے قوم پر کئے ہیں یاد کئے جاتے ہیں اور امید ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا اُس کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جائے گی۔ جس طرح ماں باپ کا غصہ اور خفگی اولاد کو بچپنے میں ناگوار گزرتی ہے مگر بڑے ہو کر اُس غصے اور خفگی کی قدر ہوتی ہے اسی طرح جو لوگ تاریکی اور جہالت کے زمانے میں اپنی قوم کو اُن کی آئندہ بھلائی کا رستہ بتاتے ہیں گو اُس وقت اُن کی باتیں سب کو ناگوار معلوم ہوتی ہیں مگر جوں جوں لوگوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اُن پر ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ جن باتوں کو ہم زہر سمجھتے تھے وہ درحقیقت ہمارے حق میں تریاق تھیں۔

یورپ میں اُن لوگوں کی یادگاریں، جنھوں نے اپنے ملک اور قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا یا چھوٹا کام اپنی زندگی میں انجام دیا ہے، طرح طرح سے قائم کیجاتی ہیں اُن کے نام کی عظیم الشان عمارتیں بنائی جاتی ہیں، اُن کے مجسمے گزرگاہوں اور شاہراہوں پر نصب کئے جاتے ہیں، اُن کی سوانحعمریاں لکھی جاتی ہیں، اُن کے کارنامے اولاد کو پڑھائے جاتے ہیں، تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی ریس کرنے اور اُن کے قدم بہ قدم چلنے کا شوق پیدا ہو۔

یورپ کا ایک مصری مسلمان سیاح جس نے اٹلی میں وہاں کے نامور لوگوں کی یادگاریں اور اسٹیچو اپنے زمانۂ سیاحت میں دیکھے ہیں لکھتا ہے کہ " میں نے اٹلی کے خواص اور عوام سب کو اُن لوگوں کے کارناموں سے بخوبی مطلع اور باخبر پایا جن کی تصویریں اور مورتیں تمام شاہی محلوں، درباروں اور گزرگاہوں میں نصب کی گئی ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اٹیلین قوم جو روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور طرح طرح کے عظیم الشان کارخانے کھول رہی ہے اور بڑی بڑی کمپنیاں قائم کر رہی ہے اس کی محرک وہی نامور لوگوں کی یادگاریں ہیں جو ہر وقت اُن کے پیش نظر رہتی ہیں اور جن کو دیکھ دیکھ کر ترقی کرنے کا خیال اور یورپ کے دول عظام کا مقابلہ کرنے کا جوش ہر وقت اُن کے دل میں موجزن رہتا ہے "

ہم مسلمانوں میں جو آباؤ اجداد کی برسی یا مشائخ و اولیاء اللہ کا عُرس کرنے کا دستور ہے

یہ بھی درحقیقت اُن کی یادگار قائم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اور اگر ان مواقع پر اُن بزرگوں کے بڑے بڑے کارناموں کا بھی ذکر ہوا کرے تو یہ بھی ایک عمدہ یادگار ہوسکتی ہے۔ اگرچہ جس قسم کی یادگاریں یورپ میں قائم کیجاتی ہیں اُن سے سلف کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہے اور برسی کے ذریعے سے سال بھر میں صرف ایک دفعہ اُن بزرگوں کا خیال آتا ہے لیکن موجودہ حالت میں اگر برسویں دن بھی یہ رسم برابر ادا ہوتی رہے اور برسی والے بزرگ کا ذکر خیر مجمع عام میں کیا جایا کرے تو اِس سے بھی قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اب میں آپ صاحبوں سے اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ سرسید مرحوم کے بڑے بڑے کاموں میں سے چند باتیں جو نہایت جلدی میں اُن کی لائف سے میں انتخاب کر سکا ہوں آپ کے سامنے عرض کردوں مگر میرے اِس بیان کو سرسید کی پوری لائف سے ایسی ہی نسبت سمجھنی چاہئے جیسی ایک نامکمل فہرست کو پوری کتاب سے ہوتی ہے۔

غدر ۵۷ء کے بعد انگلش گورنمنٹ کے سخت انتقام اور سخت سزاؤں کو دیکھ کر جو غدر کے بعد خاص کر مسلمانوں کے حق میں آئیں، اُس کے رحم اور مہربانی سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ جن غلط فہمیوں کے مسلمان شکار ہو گئے تھے اُن کے اسباب بدستور موجود تھے۔ جہالت اور تعصب اُن کے سر پر سوار تھا۔ تمام حکمران قوم مسلمانوں کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آرٹکل لکھے جاتے تھے جن سے انگریزوں کا دل مسلمانوں سے روز بروز زیادہ پھٹتا جاتا تھا۔ کچہریاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے تھے، فوج میں اُن کی بھرتی موقوف ہو گئی تھی، وہ درباروں میں بہت ہی کم بلائے جاتے تھے، غرض کہ تمام علامتیں اس بات کی موجود تھیں کہ اب مسلمانوں کا عزت اور اعتبار کے ساتھ ہندوستان میں رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرکے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جاکر بود و باش اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا مگر آخرکار اُن کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ علاوہ اور تدبیروں کے

جو انھوں نے ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے اختیار کیں انھوں نے سب سے زیادہ ضروری اِس بات کو سمجھا کہ گورنمنٹ نے بغاوت کے اسباب سمجھنے میں جو غلطی کی ہے اس کو نہایت دلیری سے گورنمنٹ پر ظاہر کر دیں۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ وقت نہایت نازک تھا خصوصًا مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنا سب سے زیادہ مشکل کام تھا۔ گورنمنٹ کو غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر سب سے زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ اُس وقت مسلمان ہونا ہی ایک بڑا سخت جرم سمجھا جاتا تھا۔ خیالات ظاہر کرنے کی آزادی بالکل نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو اُس کو ایسی قوم کی حمایت کرنی جس کو گورنمنٹ اپنا بدخواہ سمجھتی ہو اور بھی زیادہ دشوار تھا۔

الغرض انھوں نے خدا پر بھروسہ کر کے مراد آباد میں اسبابِ بغاوتِ ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے ایسے نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے نزدیک خود گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ بیان کئے اور جو اسباب کہ عمومًا انگریزوں کے ذہن میں تہہ نشین تھے اُن کی تردید کی اور اُن کو غلط بتایا۔

جب یہ رسالہ چھپ کر اُن کے پاس پہنچا اور اُن کے بعض دوستوں کو معلوم ہوا کہ وہ اس کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنا چاہتے ہیں تو انھوں نے نہایت اصرار کے ساتھ سر سید سے کہا کہ خدا کے واسطے ان کتابوں کو جلا دو۔ مگر جب انھوں نے نہ مانا تو رائے شنکر داس جو مراد آباد میں منصف اور سر سید کے نہایت دوست تھے آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو کونسل کے ایک معزز ممبر مسٹر سسل بیڈن فارن سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اُس کی نسبت یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہئے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہئے۔ مگر چونکہ اور کوئی ممبر اُن کا

ہم زبان نہ تھا اس لئے اُن کی رائے پر کچھ لحاظ نہیں کیا گیا۔ مگر کچھ دنوں بعد جب لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سر سید بھی اُس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر مسٹر سسل بیڈن نے سر سید سے تلخ لہجہ میں کہا کہ اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لئے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے سر سید نے کہا میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ممبران پارلیمنٹ کے ملاحظے کے لئے ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بہ سبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے میں سلامتی نہیں رہی اور اس لئے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں۔ پس جس طرح اُس کو میں نے ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح میں نے انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے اگر اس کے سوا ایک بھی جلد کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔ یہ سنکر مسٹر بیڈن سر سید سے بالکل صاف ہو گئے اور پھر ہمیشہ اُن کے دوست رہے۔

انگلستان کے مشہور اخبار "ہوم نیوز" نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ "سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کئے تھے اُن میں بعض نہایت قیمتی اور عملدرآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ اُن اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جا سکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔

اخبار "سینٹ جیمس بجٹ" نے اُن نتائج کے بیان کرنے کے بعد جو اس کتاب سے مرتب ہوئے اُس پر یہ ریمارک کیا تھا کہ "ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت

کے ساتھ کرتے ہیں، بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے۔"

اگرچہ ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالے کے مضامین کو بالکل تسلیم نہ کرتے ہوں یا اُس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکورۂ بالا انگریزی اخباروں کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عملدرآمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا۔ مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتاب مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کی وجہ سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا یعنی ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کئے گئے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں پہلی ہی بار مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دیو نراین سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار شریک ہوئے۔ اگرچہ اُس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اُس پودے کا جواب کسی قدر بارآور ہونے لگا ہے اور اُن کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہے گا۔

یا مثلاً کتاب مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑی بڑی ذمہ داریوں کے عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی دفعہ پنڈت شمبھو ناتھ ہائیکورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اُس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے، جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے، ملنے لگے۔

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاص کر مسلمانوں کی بھلائی کے لئے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی۔ بغاوت پر جتنے آرٹکل، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے اُن میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کیجاتی تھیں۔ کہیں ان پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ اُن کو اپنے مذہب کے بموجب

عیسائیوں سے عداوت ہے، کوئی یہ کہتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام سلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی اور سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ سلمانوں کے مذہب کی روسے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لئے سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے سرسید نے ان خیالات کی تردید کے لئے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس کا نام "لائل محمڈنز آف انڈیا" تھا اور جس میں اس بات کی شہادتیں پیش کیجاتی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیرخواہی میں جانبازی اور جاں نثاری کے کام غدر کے موقع پر سلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظاہر نہیں ہوئے۔

اس کے بعد اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جو بدگمانیاں مذہب اسلام کی نسبت قدیم سے یورپ میں چلی آتی ہیں اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی حکمران قوم یہاں کے مسلمانوں کو گورنمنٹ کے حق میں نہایت خوفناک جماعت سمجھتی ہے اُن کے رفع کرنے اور اسلام کی اصل حقیقت ظاہر کرنے کے لئے بائبل کی تفسیر لکھی جائے۔ اور جہاں تک اسلام کے اصول اہل کتاب کے اصول سے مطابق ہوں اُن میں تطبیق کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کے وجوہات بیان کئے جائیں اور اس طرح جو بدگمانیاں عیسائیوں کو اسلام کی نسبت ہیں وہ رفع کی جائیں نیز مسلمان جو موجودہ بائبل کو بالکل محرف سمجھتے ہیں اور اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک وسیع سمندر کو حائل جانتے ہیں اُن کی اس غلطی کو بھی دور کیا جائے اور اس طرح دونوں قوموں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ چنانچہ غازی پور میں انھوں نے بائبل کی تفسیر بہت بڑے پیمانے پر لکھنی شروع کی اور اپنا ہزارہا روپیہ اس کام میں صرف کیا، عربی اور عبرانی کے جاننے والے عالم نوکر رکھے اور کئی ہزار روپیہ کا پریس تفسیر چھاپنے کے لئے خریدا، اور سرکاری کام سے جو وقت بچا وہ سب اُس کے ترتیب دینے میں صرف کیا اور بڑی بڑی جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شائع کیں لیکن اس وجہ سے کہ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جس کا سرانجام کرنا سرسید کی طاقت اور مقدور سے باہر تھا اور نیز مسلمان پبلک نے اُس کی قدر نہیں کی آخر کار سرسید کو اس کام سے دست بردار ہونا پڑا۔

سنہ ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے، جو ہندوستان کے مدبرانِ سلطنت میں شمار ہوتے تھے، ایک کتاب مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر انگریزی میں لکھ کر شائع کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے کہ جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی نیز وہابیت اور بغاوت دو ہم معنی الفاظ ہیں، پس گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہئے۔ وہ اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لئے ویسے ہی موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں۔

جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر انگریزوں کو ابھی تک فراموش نہیں ہوا تھا۔ دوسرے بنگالے کے وہابیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا نیز انھیں دنوں میں مسٹر نارمن چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اس پر اور طرہ ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر پیدا کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے ان کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا۔

جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی اُس وقت سر سید پر مختلف قسم کے سرکاری اور قومی کاموں کا اس قدر ہجوم تھا کہ اُن کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اس کتاب پر ریویو لکھنا شروع کیا جو "پایونیر" کے متعدد پرچوں میں برابر شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک مشرح بیان کی اور اس بات کا اقرار کیا کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوگا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا، بلا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا۔ انھوں نے جہاد کے مسئلے کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اُس کی نسبت تھیں اُن کو اچھی طرح ظاہر کیا اور بتایا کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی پناہ میں ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں اُن کو انگریزی گورنمنٹ کے زیرِ حکومت ایسی اطاعت

وفرماں برداری سے رہنا ازروئے اسلام واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولیٰ میں مسلمان حبش میں جاکر عیسائی بادشاہ نجاشی کے زیر حکومت رہے تھے۔

سرسید کے ریویو نے انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا۔ اُن کے ایک دوست لندن میں موجود تھے اور ان کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور مسلمانوں کی نسبت بہت زہریلے خیالات پھیل گئے ہیں۔ انھوں نے سرسید کا تمام ریویو "فورٹ" "پایونیر" کے پرچوں سے نقل کرا کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوا دیا اور لندن میں جابجا تقسیم کرا دیا۔ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا یہ حال ہوا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر ہنستا تھا اور جو کچھ انھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا۔

۱۶ مارچ ۱۸۷۲ء کے "انڈین آبزرور" میں خود اُس کے یوریین اڈیٹر کا ایک زبردست آرٹکل ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اور سرسید کے ریویو پر نکلا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے سرسید کے ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا اعتبار انگریزوں کے دل سے بالکل محو کر دیا تھا۔ اسی آرٹکل میں ایک جگہ ڈاکٹر موصوف کی نسبت لکھا تھا کہ "غالباً ڈاکٹر ہنٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل لبھائے گی مگر سرسید کے ریویو نے اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھو دی ہے کہ پھر کبھی میسر نہ ہوگی۔ کتابیں پڑھنے والے ان کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھیں طاق پر رکھ دیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ قصے کی دلچسپ کتابوں کی مانند ہیں جو اپنے طرز میں نہایت دلفریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں ہوتیں۔"

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا تھا کہ "مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے اس سے زیادہ توقع نہیں ہے کہ وہ حکومتِ انگریزی کے قبول کرنے میں ضرور سرد مہری کریں گے۔" سرسید نے اس کا مفصل جواب دینے کے بعد لکھا کہ "یہ بات مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان بجز سرد مہری کے قوم حکمران کی جانب سے اور کچھ سلوک نہیں

دیکھتے تو مسلمانوں کی سرد مہری سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہئیے "ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو عیسیٰ مسیح کا یہ قول یاد رکھنا چاہئیے کہ "جس سلوک کے تم اوروں سے متوقع ہو تم کو بھی وہی سلوک اُن کے ساتھ کرنا چاہیے"۔ اس ریویو کا اخیر نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ جو وہابی مذہب کے مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ بدگمان تھی اور اُن کو برٹش حکومت کا بدخواہ سمجھتی تھی وہ بدگمانی اب بالکل جاتی رہی ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہوگئی ہے کہ وہابیوں کے اصولِ مذہب کی ناواقفیت کے سبب سے یہ تمام بدگمانیاں پیدا ہوئی تھیں۔

الغرض غدر کے بعد ایک مدت دراز تک سر سید برابر ایسی تدبیریں کرتے رہے جن سے انگریزوں کے دل جو اس واقعے کے سبب ہندوستانیوں سے مکدر ہو گئے ہیں کسی طرح اُن کی کدورت رفع ہو اور خاص کر جو بدگمانیاں مسلمانوں کی طرف سے عام طور پر اُن میں پھیل گئی ہیں اُن کو دور کیا جائے اسی غرض سے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ میں قائم کی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور ربط واتحاد پیدا ہو اور علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جائیں اور بذریعہ ترجموں کے ملک میں علم کی روشنی پھیلائی جائے اور سوسائٹی سے ایک ایسا اخبار اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں جاری کیا جائے جس سے ہندوستانیوں کے خیالات انگریزوں پر اور انگریزوں کے خیالات ہندوستانیوں پر ظاہر ہوتے رہیں۔

پھر جب اُن کی تبدیلی غازیپور میں ہوگئی تو وہاں جا کر انھوں نے انگریزی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جس کے انتظام کے لئے ہندو مسلمانوں کی متعدد کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور انگریزی کے سوا اُردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی اُس میں انتظام کیا گیا۔ یہ مدرسہ آجتک "وکٹوریہ اسکول" کے نام سے جاری ہے اور ہائی سکول تک کی پڑھائی اُس میں ہوتی ہے۔

جب غازیپور سے سر سید کی تبدیلی پھر علیگڈھ ہوگئی تو یہاں آ کر انھوں نے ایک اور انجمن ۱۸۶۶ء میں قائم کی جس کا نام "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسوسی ایشن کے ذریعے سے ہندوستان کے حالات اور معاملات کی اطلاع پارلیمنٹ تک پہنچتی رہے اور

جس طرح اینگلو انڈینز نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کی ہے اسی طرح تمام اضلاعِ شمال ومغرب کی جانب سے ہندوستانی بھی ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اُس کے ذریعے سے اپنے تمام مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچاتے رہیں

۱۸۶۶ء ہی میں انھوں نے صوبۂ مذکور میں تعلیمی کمیٹیاں قائم ہونے کی تحریک گورنمنٹ میں کی اور زمینداران علیگڑھ کی طرف سے ایک درخواست گورنمنٹ میں اس غرض سے بھجوائی کہ تعلیم کے انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی، کہ علاوہ جمع مالگذاری کے ایک روپیہ سیکڑہ ہم سے لیا جاتا ہے، دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکام ضلع اور افسرانِ سررشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں۔ چنانچہ اول ضلع علیگڈھ اور اٹاوہ میں امتحاناً تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور آخر کار تمام اضلاعِ شمال مغرب میں اُن کا تقرر منظور کیا گیا۔

۱۸۶۷ء میں انھوں نے "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کی طرف سے گورنمنٹ ہند میں اس مضمون کی درخواست بھیجی کہ اضلاعِ شمال مغرب میں ایک ورنیکلر یونیورسٹی قائم کیجائے جس میں بڑے بڑے علوم وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے بشرطیکہ ہائی[1] ایجوکیشن کو، جو بذریعہ کلکتہ یونیورسٹی کے اس صوبہ میں جاری ہے، کچھ صدمہ نہ پہنچے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ورنیکلر یونیورسٹی سے انگلش ہائی ایجوکیشن کو ضرور صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے تو انھوں نے یہ خیال بالکل چھوڑ دیا۔

انھیں دنوں میں سرسید نے انگریزوں اور مسلمانوں میں ربط اور اتحاد بڑھانے کی غرض سے ایک رسالہ اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے جواز پر لکھ کر شائع کیا جس میں اُن تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علما مواکلتِ اہلِ کتاب پر کرتے تھے اور مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ کھانے

---

(۱) انگریزی کی اعلیٰ تعلیم ۱۲

پینے سے منع کرتے تھے، آیتوں اور حدیثوں اور فقہ کی کتابوں سے مدلل کرکے لکھا تھا۔ اس رسالہ کا جو اثر ہندوستان میں ہوا اُس کے بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کیونکہ انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا اب ہندوستان میں ایسا عام ہوگیا ہے کہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی ہے اور جو اُن سے ملتے جلتے ہیں وہ عموماً اُن کے ساتھ کھانے پینے سے اجتناب نہیں کرتے۔

غرض کہ ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک وہ برابر اُن تدبیروں میں سرگرم رہے جن سے ملک اور قوم کی بھلائی متصور تھی۔ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اُس وقت تک اُن کا بنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا ممکن نہیں۔ اس منصوبے کے پورا کرنے کے لئے انھوں نے نہایت ضروری سمجھا کہ چند روز انگلستان میں جاکر قیام کریں اور وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور پھر ہندوستان پہنچ کر جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی تعلیم کی بنیاد ڈالیں۔ اس کے سوا انھیں دنوں میں سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاعِ شمال و مغرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حال چار جلدوں میں شائع کیا تھا جس میں اسلام اور بانیٔ اسلام پر دل کھول کر نکتہ چینی کی گئی تھی جس وقت سے وہ کتاب شائع ہوئی تھی سرسید کو اُس کی تردید لکھنے کے خیال نے بے چین کر رکھا تھا۔ مگر اُس کی تردید لکھنے کے لئے جن کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں نایاب تھے اور صرف "برٹش میوزیم" یا "انڈیا آفس" کے کتب خانوں میں مل سکتے تھے۔

لیکن سرسید احمد خاں جیسے بے سرمایہ آدمی کا ولایت جانا اور وہاں جاکر ایک جنٹلمین کی حیثیت سے قیام کرنا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا مگر وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے، حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لئے علاوہ تین تین ہزار روپیہ خرچۂ آمد و رفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کے نو وظیفے چند صوبوں کے واسطے منظور کر لئے اور صوبۂ اضلاع شمال و مغرب کا وظیفہ سید محمود مرحوم کو مل گیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لئے بھی کافی نہ تھا مگر گورنمنٹ کی اس

امداد سے سرسید کے ارادے کو بہت تقویت ہوئی۔ الغرض انھوں نے اس غرض کے لئے گورنمنٹ سے رخصت کی درخواست کی اور بعد منظوری رخصت کے اپنی کتابیں اور اثاث البیت بیچ کر اور گھر اور کوٹھی کو رہن رکھ کر مع سید حامد اور سید محمود کے یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے انگلستان روانہ ہو گئے۔

سرسید کے اس سفر کا مفصل حال بہت طول طویل ہے اس لئے اُن کے ایک معزز دوست کی تحریر سے جو اُن کے سفر انگلستان کے متعلق لکھی گئی تھی، ہم ذیل کی چند سطریں اس مقام پر نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں

وہ لکھتے ہیں کہ " سید احمد خاں ولایت گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو، جو اس وقت تمام اقوامِ روئے زمین پر شرف رکھتی ہے، انھیں کے ملک اور انھیں کے گھروں میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشا گاہ تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامیِ دینِ اسلام کتب خانے میں بیٹھا ہوا سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے "۔

سرسید نے ولایت میں سترہ مہینے قیام کیا۔ اس عرصے میں انھوں نے اُس مشکل سبق کے علاوہ جو مسلمانوں میں تعلیم و تربیت پھیلانے کا وہاں رہ کر سیکھا تھا، سر ولیم میور کی کتاب کا جواب بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھا اور اس کا ترجمہ انگریزی میں کرا کر انگلستان ہی میں شائع کیا۔ ایک انگریز مسمیٰ "جان ڈیون پورٹ" نام جس نے مسلمانوں کی حمایت میں عیسائیوں کے برخلاف ایک کتاب موسوم بہ "اپالوجی" لکھی تھی اور اُس کے چھپوانے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اس کو ہندوستان سے سرسید نے چندہ جمع کرا کے چھپوایا۔ اور چند اسی قسم کی کتابیں جو انیسویں صدی کے شروع میں بعض منصف مزاج انگریزوں نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھیں اور اب نایاب ہو گئی تھیں اُن کو بڑی جستجو سے

بہم پہنچایا اور اس میں سے بعض کا ہندوستان میں ترجمہ کرا کر شائع کیا۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب جس کا نام "خطبات احمدیہ" ہے اُس پر مفصل ریویو کرنا اور اُس کی خوبیاں آپ صاحبوں کے سامنے اس وقت بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر چند لائق انگریزوں نے جو اس کتاب کی نسبت عمدہ رائیں لکھی ہیں ان کا مختصر طور پر یہاں ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اخبار "انکوائرر" نے اُسی زمانے میں "خطبات احمدیہ" پر ایک مبسوط آرٹیکل لکھا تھا جس میں اُس نے اقرار کیا تھا کہ مصنف نے لٹریچر کے مرد میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے۔ وہ ایک موقع پر، جہاں سر سید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لئے رحمت تھا، لکھتا ہے کہ "بے شک ہیئت اور طب یہ دونوں علم اور پروٹسٹنٹ اور یونی ٹیرین یہ دونوں مذہب اُن فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے عیسائی مذہب کو عطا کئے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی طور پر شکر گزار ہوں گی۔ ان فوائد میں سے ہر ایک فائدے کے تھے اور سب فائدول کے تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جو زبردست تحریک یورپ میں اندلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی وہ مذکورۂ بالا فوائد میں منحصر نہیں ہے بلکہ فن تعمیر، شاعری، معاشرت اور آداب سب پر اُس کا کافی اثر پہنچا ہے۔"

اسی کتاب میں ایک جگہ عیسائیوں کے اس طعن کا جواب دیتے وقت کہ، اسلام کی بنیاد محض عیسائی اور یہودی مذہب پر رکھی گئی ہے، سر سید نے لکھا تھا کہ مسلمان اپنی سب سے بڑی عزت یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سچے اور ایماندار پیرو ہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے۔ اس پر ریویو نگارِ مذکور لکھتا ہے کہ "یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کئے جانے کے قابل ہیں۔ ان پر فی الحقیقت کیتھولسٹی کے سچے اصول کی مہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع اصول مختلف مذہبوں میں مصالحت پیدا کر سکتا ہے تو وہ صرف یہی اصول ہے اور بس۔"

ریورنڈ ہوپر جو ایک زمانے میں لاہور ڈیویٹنی کالج میں پرنسپل تھے انھوں نے اسی کتاب کے متعلق میرے ایک دہلوی دوست سے کہا تھا کہ "ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا ہے۔ جبکہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے ہیں اُن پر اسلام کی خوبی ظاہر کرتے، اُن کے ملکوں میں جاکر انھیں کی زبان میں وعظ کہتے یا انھیں کی زبان میں اسلام کے حق ہونے پر کتابیں لکھتے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو"

کرنل گریہم سر سید کی لائف میں "خطبات احمدیہ" کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب . . . . . جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دین محمدی فی زماننا انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بوناپارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور اُس میں ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی کی خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ جب سید احمد خاں کے "خطباتِ احمدیہ" کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ سید احمد خاں نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا ہے جس میں مصنف پر خوب لے دے کی ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور سمجھ دار ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔"

مذکورۂ بالا رایوں سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ "خطباتِ احمدیہ" نے انگریزوں

کے دل پر کیا عمدہ اثر کیا تھا۔ اور جو کتابیں قدیم مخاصمانہ طریقے کے برخلاف شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر مفید اور فریقِ ثانی کو کس قدر انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

سرسید نے ولایت سے ہندوستان میں آکر جو سب سے بڑا اور عظیم الشان کام مسلمانوں کی حقیقی اور اصلی بھلائی کا کیا اور جس سے میری مراد علیگڈھ میں "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کا قائم کرنا ہے، اُس کی عظمت اور بڑائی سے سب لوگ واقف ہیں اور اُس کی نسبت زیادہ تفصیل بیان کرنے کی اس موقع پر ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم نہایت مختصر طور پر اُس کی ابتدا اور جس حد تک اُس نے ابتک ترقی کی ہے اُس کا ایک خاکہ کھینچ کر حاضرین کو دکھانا چاہتے ہیں۔

ولایت جانے سے پہلے سرسید احمد خاں نے اپنے ایک معزز بزرگ سے بر سبیل تذکرہ یہ الفاظ کہے تھے کہ "اگر مسلمانوں کی تعلیم کا سامان مہیا کرنے کے لئے مسلمانوں سے چندہ جمع کیا جائے تو آپ کے نزدیک دس لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں" وہ یہ الفاظ سن کر بے اختیار ہنس پڑے اور کہا کہ یہ تمھارے ویسے ہی شیخ چلی کے سے منصوبے ہیں جو تم ہمیشہ باندھا کرتے ہو۔ میرے نزدیک تو مسلمانوں سے اس کام کے لئے بجائے دس لاکھ کے دس رُپے کے ملنے کی بھی امید نہیں ہے۔

صاحبو! یہ کچھ کم تعجب کی بات نہیں ہے کہ جس درس گاہ کے لئے ۱۸۶۹ء میں چھ کروڑ مسلمانوں سے دس لاکھ رُپے وصول ہونا محال سمجھا جاتا تھا آج اُس کی شہرت اور مقبولیت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ بمبئی کے ایک مسلمان تاجر نے انھیں دنوں میں اُس کے لئے ایک لاکھ دس ہزار روپیہ دیا ہے اور اس کا سالانہ خرچ ایک لاکھ روپیہ تک پہنچ گیا ہے اور صرف اُس کی عمارات پر دس لاکھ سے بہت زیادہ اب تک خرچ ہو چکا ہے اور جس مدرسے کا ۱۸۷۵ء میں قوم کی مخالفت کے سبب ہائی اسکول کے درجے تک پہنچنا غیر

ممکن معلوم ہوتا تھا اب وہی قوم اُس کو یونیورسٹی بنانے کی تدبیریں کر رہی ہے جس مدرسے میں کوئی دہلی یا علیگڈھ کا مسلمان بھی اپنے لڑکے کو بھیجنا نہیں چاہتا تھا آج اُسی میں پنجاب، ممالکِ متحدہ، بنگال مدراس، برہما، آسام، گجرات، بلوچستان، افغانستان اور ایران تک کے سات سو مسلمان بورڈر تعلیم و تربیت پاتے ہیں۔

علیگڈھ محمڈن کالج سے جس قدر مسلمانوں نے اب تک تعلیم میں ترقی کی ہے اُس کو اعداد کے ذریعے سے ہم اس وقت ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے۔ ہم کو اس امر کی نسبت صرف اس قدر معلوم ہے کہ جب سے کلکتہ بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہوئی تھیں اُس وقت سے لے کر ۱۸۸۱ء تک یعنی اُس وقت تک کہ علیگڈھ کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئٹس کی تعداد صرف ۴۳ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف ۱۲ سال میں تمام ہندوستان کے گریجوئٹس کی تعداد ۴۳ سے بڑھ کر ۳۹۹ تک پہنچ گئی۔

سرکاری ملازمت میں جو پست حالت مسلمانوں کی تھی اُس کا کسی قدر اندازہ پایونیر مورخہ ۱۸۷۰ء کے اس فقرہ سے ہو سکتا ہے جو اُس نے صوبۂ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ "تمام بنگال میں چند مسلمان عہدیدار ہیں جو جلد پنشن لینے والے ہیں اور اُن کی جگہ پر یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نظر نہ آئے گا۔" اگرچہ پایونیر نے یہ فقرہ بنگال کی نسبت لکھا تھا لیکن اگر سرسید کی چیخ پکار سے شمالی ہندوستان میں تعلیم کا چرچا نہ پھیل جاتا تو یہی حال پنجاب اور اضلاعِ شمال و مغرب میں مسلمانوں کی سرکاری ملازمت کا ہونے والا تھا۔ لیکن جب سے علیگڈھ کالج کے اعلیٰ امتحانوں کے نتیجے نکلنے لگے ہیں اُس وقت سے مسلمان ملازموں کی تعداد معزز عہدوں پر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مسلمان بیرسٹروں اور وکیلوں کا شمار بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت سر آکلینڈ کالون نے جبکہ وہ اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر تھے، کہا تھا کہ "جو شخص اُن نوجوانوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلتے ہیں

وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے گریجوٹس ظاہر کرتے ہیں۔ علیگڑھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔"

——— سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے صرف محمڈن کالج ہی کے قائم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" اسی غرض سے ۱۸۸۶ء میں قائم کی جس نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا غل ڈالدیا۔ انھوں نے ایک دوسری ایسوسی ایشن "محمڈن سول سروس فنڈ" کے نام سے اس لئے قائم کی کہ قومی چندے سے مسلمان طالبعلموں کو سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے انگلستان بھیجا جائے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہائی ایجوکیشن کو گھٹا کر مشرقی تعلیم کو ترقی دینے کا ہے اور لارڈ رپن کی ایک اسپیچ سے جو لاہور میں اہل پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے دی تھی، اُن کو یقین ہوگیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کا لج کو یونیورسٹی کے اختیارات مِل گئے تو پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کا نام و نشان باقی نہ رہے گا تو انھوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھ کر شائع کئے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑ گیا اور اہل پنجاب میں سے جو لوگ انگریزی تعلیم کی جگہ مشرقی تعلیم پر پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد رکھنی چاہتے تھے اُن کے خیالات بالکل بدل گئے۔ پھر جب ۱۸۸۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی اُسی اصول پر قائم ہونے لگی جس پر پنجاب یونیورسٹی کے قائم ہونے کا گمان تھا اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور سابق لفٹنٹ گورنر جو مشرقی علوم کے بڑے قدردان تھے اُن کی پُرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دی جائے، تو انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی بھی اُسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسی کہ پنجاب یونیورسٹی کی کی تھی۔ جو زبردست آرٹکل اُنھوں نے الہ آباد یونیورسٹی پر لکھا تھا اُس میں انھوں نے صاف صاف لفظوں میں تحریر کیا کہ "اگر بالفرض یہ یونیورسٹی

مغربی تعلیم کی سدّراہ ہو تو ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہ کرنی چاہئے اور خود اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہئے کہ اُس کو بلاشبہ لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر اُن کی رایوں پر نہیں۔"

اگرچہ بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ فی الواقع انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا چاہتی ہے اور سرسید کی تحریروں نے گورنمنٹ کی پالیسی پر کچھ اثر کیا یا نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ جو دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اعلیٰ مغربی تعلیم کی جڑ کاٹنے والی ہوگی ویسا ظہور میں نہیں آیا۔ دونوں یونیورسٹیوں نے اب تک کوئی ایسا قاعدہ مقرر نہیں کیا جو انگلش ہائی ایجوکیشن کی گاڑی میں روڑا اٹکانے والا ہو۔

—— سرسید نے مسلمانوں میں صرف انگریزی تعلیم کے پھیلانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مغربی علوم سے جو مضر نتیجے مذہبی دنیا میں عموماً پھیل رہے ہیں اور روز بروز زیادہ پھیلتے جاتے ہیں اُن کے انسداد میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ سعی و کوشش کا فروگذاشت نہیں کیا۔ اُن کو معلوم تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان، خواہ عیسائی اُن کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا مدرسے میں ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلے کا ثبوت اُن کو ملتا رہتا ہے۔ اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کی حقارت اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ سرسید کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت یورپ کے اکثر ملکوں میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا اور عیسائی مذہب کمزور ہوتا جاتا ہے، اس لئے انھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں اُس کی مضرتوں کا انسداد کرنا بھی اپنا فرض سمجھا۔ وہ ابتدا سے وقتاً فوقتاً "تہذیب الاخلاق" میں اُن شبہات کے جواب برابر لکھتے رہے جو

سائنس کی رو سے اصول اسلام پروار د ہونے ممکن تھے ۔ انھوں نے اسی غرض سے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی جس کو باوجود طرح طرح کے موانع اور ہجوم مشاغل کے وہ برابر اوقاتِ فرصت میں لکھتے رہے اور نصف سے زیادہ قرآن کی تفسیر سات جلدوں میں لکھ کر چھوڑ گئے۔

صاحبو! میں اُس مرحوم کی کس کس بات کو بیان کروں ۔ اُس کی پچاس برس کی کوشش سے جو عظیم الشان فائدے ملک اور قوم کو پہنچے ہیں اور جو جلیل القدر خدمتیں دین اسلام کی اُس سے ظہور میں آئی ہیں اُن کا ان چند سطروں میں آپ کے روبرو بیان کرنا میرے لئے بلا مبالغہ ایسا ہی مشکل کام ہے جیسے دریا کا کوزے میں بند کرنا ۔ شمالی ہندوستان میں جس قدر انجمنیں، سوسائٹیاں، سبھائیں اور کانفرنسیں قائم ہوئی ہیں جس قدر ہندو اور مسلمانوں نے ملک کے اطراف وجوانب میں مذہبی اور علمی درسگاہیں قائم کی ہیں، اور جس قدر اردو، ہندی اور سنسکرت میں ۲۶ برس کے عرصے میں تالیفات اور تصنیفات اور تراجم ملک میں شائع ہوئے ہیں، اور جس قدر اردو اور ہندی اخبارات اور رسالے ملک کے ہر گوشے میں جاری ہوئے ہیں، اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اُسی ایک انسان ضعیف البنیان کی تحریک کے کرشمے ثابت ہوں گے ۔ اگر میرے ان تمام دعووں کا ثبوت کسی صاحب کو درکار ہو تو وہ "حیات جاوید" (سر سید کی لائف) کو ملاحظہ کریں ۔ مگر مثال کے طور پر میں یہاں صرف اردو لٹریچر کی ترقی کا ذکر کرتا ہوں ۔

——— جو لوگ اُردو لٹریچر اور اُس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ضرور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اُردو لٹریچر کی ترقی اُس انعامی اشتہار کے اجراء کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے جو ۲۶ راگست ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ شمال و مغرب نے جاری کیا تھا اور جس نے ۲۶ برس کے عرصے میں ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک نہ صرف اُردو بلکہ اکثر دیسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا ۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ میں، جو دیسی زبانوں میں

تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ اُن لوگوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور وہ خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس لٹریری ترقی کا باعث بھی وہی مرحوم تھا۔ سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے بمقام علیگڈھ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کے حضور میں جو اڈریس ۹ ر مئی ۱۸۶۸ء کو پیش کیا تھا اُس میں درخواست کی تھی کہ جو کتابیں دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں اُن کی گورنمنٹ کی طرف سے قدردانی ہونی چاہئے۔ اور ہز آنر نے اڈریس کے جواب میں وعدہ کیا تھا کہ اِس درخواست پر ضرور لحاظ لیا جائے گا۔ چنانچہ ۲۶ ر اگست ۱۸۶۸ء کو یعنی اڈریس پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ ممدوح نے مذکورہ بالا انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہیگا۔ یہ تو اردو کی عام اور سطحی ترقی کا حال تھا مگر اُس کی اصلی اور حقیقی ترقی کی بنیاد خود سرسید نے اپنے پرزور ہاتھوں سے ڈالی ہے جو علیگڈھ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور سرسید اور اُن کے دوستوں کی تحریرات کے ذریعے سے ظاہر ہوئی ہے۔

اگرچہ سرسید کی مخالفت اب ملک اور قوم میں بہت کم ہوگئی ہے مگر اب بھی کسی قدر اُن کے مخالف نہ صرف عوام میں بلکہ خواص میں بھی ایسے موجود ہیں جو نہ صرف سرسید کی تصنیفات پر بلکہ اُن کے اخلاق و عادات پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ مخالفوں کی نکتہ چینی بالکل درست ہے تو بھی کوئی مسلمان جس کے دل کی آنکھ میں بصیرت کا نور باقی ہے سرسید کے ان تمام کاموں پر جو روزِ روشن کی طرح تمام عالم پر ظاہر ہیں، خاک نہیں ڈال سکتا۔ نواب عمادالملک نے نظام کلب کے جلسۂ دعوت میں جو ۱۸۹۱ء میں سرسید کے لئے منعقد ہوا تھا اُن لوگوں کے جواب میں جو سرسید کے ہر ایک کام کو حبِّ جاہ اور ناموری و شہرت کی خواہش پر محمول کرتے ہیں، نہایت عمدہ بات کہی تھی کہ "کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں جیسا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لئے ایسے ہی مفید کام

کرکے دکھادے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں "۔

احمدزکی آفندی نے جو ۱۹۰۲ء میں یورپ کا سفر کیا ہے اس کے ذکر میں یورپ کے اکثر محبانِ وطن مثل گیری بالڈی، نیلسن گیمبٹا اور ملکہ کیتھرائن وغیرہ کا حال اور اُن کے اخلاقی عیوب بیان کرکے لکھتا ہے کہ "اہل یورپ اپنے اپنے ملک کے محبانِ وطن اور خادمانِ قوم کے شخصی اور خانگی کاموں کو خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے کبھی نہیں دیکھتے اور کبھی بھول کر بھی اُن کی بُرائیوں کا ذکر زبان پر نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ اُن کے عام اور مفید کاموں کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے اپنی کوشش سے اپنے ملک کو پہنچائے ہیں، طرح طرح سے ان کا نام زندہ کرتے ہیں اور اُن کا ذکر خیر اعلیٰ علیین تک پہنچاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اٹلی، فرانس اور انگلستان کو آسمان تک پہنچا دیا ہے اور اُن کے رُعب وداب کے آگے دنیا بھر کا سر جھکا دیا ہے۔"

مگر افسوس ہے کہ ہماری قوم میں ایک محب وطن اور خادم قوم کی یہ قدر کی جاتی ہے کہ جب اس میں بظاہر کوئی اخلاقی عیب یا کمزوری نظر نہیں آتی تو اُس کی نیت اور اس کے دل کو ٹٹولتے ہیں اور وہاں پہنچ کر ڈنک مارتے ہیں اور گویا یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس وحی آئی ہے کہ یہ شخص بظاہر جتنے کام قوم کی بھلائی کے کرتا ہے اُن سے اُس کی غرض اپنی ناموری اور شہرت بڑھانے اور گورنمنٹ میں اپنا اعزاز زیادہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور ہم میں ایسے لوگ پیدا ہونے موقوف ہوگئے ہیں جو اپنی کوشش سے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچائیں۔ برخلاف اس کے ہم ہندوستان کی دیگر ہمسر قوموں میں برابر دیکھتے ہیں کہ ان میں ایسے جوانمرد اور محبِ وطن بکثرت پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں کیونکہ اُن کی قوم اُن کی عزت کرتی ہے اور اُن کے قدموں کے تلے آنکھیں بچھاتی ہے، اور ہرگز اپنے صوبے کے گورنر کی بھی ایسی تعظیم و تکریم نہیں کرتی جیسی اپنے ملک اور قوم کے ایک ادنیٰ خادم کی عزت کرتی ہے۔

اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور خاتمے پر ایک بند سرسید کے مرثیہ کا پڑھتا ہوں جس

کے مضمون پر غور کرنا، امید ہے کہ میرے ہم قوموں اور ہم وطنوں کے حق میں مفید ہوگا:۔

میتواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن — در فصاحت ہمچو سحباں در خرد لقماں شدن
میتواں در جاہ و ثروت گوئی از قارون بُرد — میتواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن
میتواں در ملک و دولت خسرو پرویز گشت — میتواں در زور و طاقت رستمِ دستاں شدن
میتواں قطبِ زماں شد میتواں شد غوثِ وقت — ہر چہ خواہی میتوانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی طپیدن از تپ ہمسائگاں — از سمومِ نجد در باغِ عدن پژمراں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریٔ ابنائے جنس — در شبستان تنگدل از محنتِ زنداں شدن
آتشِ قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت — بر فرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن
زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر فکرِ قوم — گر توانی میتوانی سید احمد خاں شدن
میتوان مقبولِ عالم گشت اما ہمچو شیخ — بہرِ سودِ خلق مردودِ جہاں نتواں شدن

جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

۱۱- اجلاس کراچی کی آخری تقریر

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۰۸ء)

ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی کی وہ تقریر جو مولانا نے جلسہ ختم کرتے ہوئے فرمائی۔

حضرات! الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ ہماری کانفرنس کا اکیسواں اجلاس فضل الٰہی سے بخیر و خوبی اور توقع سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا اور اس کی طلائی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوا۔ اس سال کانفرنس کے اجلاس کی طرف سے طرح طرح کے خدشے لوگوں کے دلوں میں گشت کر رہے تھے (اولاً) نواب محسن الملک مرحوم کی وفات سے کانفرنس کو سخت صدمہ پہنچا معلوم ہوتا تھا (دوسرے) کراچی کے بُعد مسافت کی وجہ سے بہت ہی کم ڈیلیگیٹوں کے آنے کی امید تھی۔ (تیسرے) ملک سندھ بلحاظ تعلیم کے ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں سے زیادہ پست حالت میں سمجھا جاتا تھا اور اہل سندھ کو تعلیم سے تنفر بلکہ اس کا مخالف خیال کیا جاتا تھا اور اس لئے خیال تھا کہ دیکھئے جس مقصد کے لئے اس صوبہ میں کانفرنس منعقد ہوئی ہے اُس میں کہاں تک توجہ ظاہر کرتے ہیں۔ مگر خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے وہ تمام خدشے رفع کر دیئے۔ نواب محسن الملک مرحوم کے جانشین نواب وقار الملک بہادر اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سکرٹری سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس "نے جس سرگرمی اور عرقریزی سے اپنے فرائض ادا کئے ہیں اُس کا شکریہ ادا کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ انھوں نے اُس نقصان کی پوری تلافی کی ہے جو نواب صاحب مرحوم کی وفات سے قوم کو پہنچا تھا۔ پھر جس قدر ڈیلیگیٹ ہندوستان کے اطراف و جوانب اور دور و دراز مقامات سے تشریف لاکر اجلاس میں شریک ہوئے

اُن سے نصف کے آنے کا بھی کسی کو گمان نہ تھا اور یہ نہایت بین ثبوت اس بات کا ہی کہ جو عام غفلت اور بے پرواہی اور قومی کاموں کی طرف سے بے اعتنائی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور لوگ نہایت شوق اور امنگ سے قومی تقریبوں میں شریک ہونے لگے ہیں۔ اہل سندھ کی طرف سے جو بے توجہی کا گمان تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ بالکل غلط نکلا جس ذوق و شوق سے عام مسلمانان سندھ کانفرنس کے اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے رہے ہیں اور جو دلچسپی انھوں نے اس موقع پر ظاہر کی ہے وہ نہایت روشن ثبوت اس بات کا ہے کہ خدا کے فضل سے اُن میں اپنے تنزل کا احساس اور ترقی کا میلان بوجہ احسن پیدا ہوگیا ہے اور وہ اپنی بُرائی بھلائی اور زمانے کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں اور اپنے خیر خواہوں کی قدر کرنے لگے ہیں۔ بعض نہایت ضروری اور حد سے زیادہ مفید رزولیشن جو اُن کی عام رضامندی سے پاس ہوئے ہیں وہ اُن کے جوہر قابل ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ چراغ میں تیل اور بتی سب کچھ موجود ہے صرف روشنی کرنے کی دیر ہے۔

مگر اے صاحبو! اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو یہ سب امید افزا علامتیں (اولاً) افسران سرکاری اور خاص کر جناب ینگ ہسبنڈ صاحب کمشنر سندھ کی توجہ اور (ثانیاً) جناب آنریبل خان بہادر وزیر خیر پور اور مسٹر دہلوی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔ اگر ایسے ہمدرد قوم جیسے کہ وزیر صاحب اور مسٹر دہلوی ہیں، سندھ میں دو چار اور پیدا ہو جائیں تو امید ہے کہ بہت جلد سندھ کے دن پھر جائیں گے جس کام کا بیڑا انھوں نے اٹھایا ہے وہ ایک نہایت عظیم الشان کام ہے اور ایسا دشوار گذار مرحلہ ہے کہ جب تک اُن کے بہت سے ایسے مددگار اس صوبے میں پیدا نہ ہوں گے جو دم سے، قدم سے، درم سے، قلم سے ان کی امداد نہ کریں اور اُن کی ہمت نہ بندھائیں، اس مرحلے کا طے ہونا نہایت دشوار ہے۔ خدا کی ذات مسبب الاسباب ہے۔ جبتک اسباب مہیا نہیں ہوتے کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں

آتی - چونکہ قومی مشکلات کا حل ہونا قوم کی متفقہ ہمدردی و دلسوزی پر موقوف ہے اس لئے جب تک بہت سے قوم کے ہمدرد پیدا نہ ہوں گے - اس مقصد میں کامیابی ناممکن ہے۔

عاشق کہ شد کہ یار بہ حالش نظر نہ کرد   اے خواجہ ! درد نیست وگرنہ طبیب ہست

صاحبو! سب سے بڑی کامیابی اس سال کی کانفرنس میں یہ ہوئی ہے کہ جس قدر رزولیشن پاس ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر عملی اور نتیجہ خیز ہیں اور گورنمنٹ کی توجہ اور قومی لیڈروں کی کوشش سے امید ہے کہ اُن پر بہت جلد عملدرآمد ہوگا - اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کراچی کا اجلاس قوم کے حق میں اور خاص کر اہل سندھ کے حق میں مثمر برکات و منتج حسنات ہو - وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین -

۱۲۔ تقریر بموقعہ عطائے خطاب حکیم اجمل خاں

(از علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۰۸ء)

۱۹۰۸ء کے شروع میں جب حکیم محمد اجمل خاں صاحب (مرحوم) کو گورنمنٹ نے "حاذق الملک" کا خطاب مرحمت فرمایا تو حکیم صاحب کو مبارکباد دینے اور گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے، جنوری ۱۹۰۸ء کو باشندگان دہلی کا ایک عظیم الشان جلسہ کمپنی باغ کے ٹاؤن ہال میں نواب امیرالدین احمد خاں صاحب والیٔ ریاست لوہارو کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مولانا اُس وقت اتفاقاً دہلی میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی جلسہ میں شرکت فرمائی۔ مولانا نے یہ تقریر اسی جلسے میں فرمائی تھی۔

صاحبو! آج ہم ایک ایسی خوشی کے اظہار کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں جس میں امید ہے کہ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ دل سے شریک ہوں گے۔ جس میں بناوٹ اور ظاہرداری کا کچھ لگاؤ نہیں معلوم ہوتا اور جو بعینہ ایسی ہی خوشی ہے جیسی مسلمانوں کو عید بقرعید میں، ہندؤں کو ہولی دیوالی میں اور بڑے دن کی تعطیل میں ہر ایک قوم کو اپنی اپنی کانفرنس یا کانگریس کی خوشی ہوتی ہے۔

جو معزز خطاب گورنمنٹ ہند نے جناب رئیس الاطبا حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو حال میں عطا کیا ہے وہ نہ صرف اہل دہلی و نواح دہلی کے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصہ اور صوبہ کے لوگوں کو خوشی کا باعث ہوا ہے۔ حکیم صاحب جس نامور اور شہرۂ آفاق خاندان کے ممبر ہیں اُس کی ناموری اور شہرت ہندوستان کی حدود سے گذر کر ایشیا کے اکثر حصوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس خاندان نے صرف علم طب، حذاقت اور دست شفا

ہی میں نام نہیں پیدا کیا بلکہ جس فیاضی، فراخ حوصلگی اور سیر چشمی کا برتاؤ ہر ادنیٰ اعلیٰ مقیم مسافر اور دور و نزدیک کے ساتھ اس خاندان میں دیکھا گیا ہے اس کی مثال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ شاید تمام دُنیا کے طبیبوں اور ڈاکٹروں میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس گھرانے کی طرف لوگوں کے دل خود بخود کھنچتے ہیں، دور دور کے باشندے بیماروں کو لے کر یہاں علاج کے لئے آتے ہیں اور اُن کی عقیدت اور محبت کا نقش دلوں میں لے کر جاتے ہیں۔

صاحبو! ہمارے معزز و محترم ہیرو جن کے خطاب ملنے کی خوشی میں ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں، آپ سن چکے ہیں کہ وہ اسی معزز خاندان کے رکن ہیں۔ ہم گورنمنٹ کے دل سے شکر گذار ہیں کہ اُس نے ان کا خاندانی خطاب، خاندانی مطب کی مسند پر بیٹھنے کے چند ہی روز بعد ان کو عنایت فرمایا ہے۔ بلاشبہ یہ خطاب چونکہ ان کا خاندانی خطاب اور سلطان وقت کا عطیہ ہے جس قدر اُس کی عظمت کیجائے تھوڑی ہے۔ لیکن اے صاحبو! حاذق الملک ایک ایسا خطاب ہے جو عام خطابات کی طرح صاحبِ خطاب کی ایک خاص حیثیت پر دلالت کرتا ہے۔ مگر ہمارے محترم ہیرو میں اور بہت سی ایسی حیثیتیں موجود ہیں جو خاص کر جماعت اطبا میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ عربی اور فارسی لٹریچر سے خاص مناسبت رکھتے ہیں، دونوں زبانوں میں مثل اہل زبان کے تکلم کر سکتے ہیں۔ طب میں بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں، قومی خدمات سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں حسن اخلاق کے لحاظ سے میں ان کو ایک غیر معمولی انسان خیال کرتا ہوں۔ میں اُن کے اخلاقی فضائل کا زیادہ ذکر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ اُن کی زیادہ مدح و ثنا کہیں اُن کو وسعت اخلاق میں زیادہ ترقی کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ اُن کے اخلاق اب اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ انھوں نے ابنائے جنس کی خدمت پر اپنے ضروری آرام و آسائش کو جس کے بغیر انسان کی صحت قائم نہیں رہ سکتی قربان کر دیا ہے۔

بہرحال جناب حکیم محمد اجمل خانصاحب کو جو خطاب گورنمنٹ ہند نے عنایت فرمایا ہے

ایک ایسا موزوں اور چسپاں خطاب ہو کہ اس سے زیادہ مفید اور چسپاں خطاب نہیں ہو سکتا۔ اور اس خطاب سے صرف حکیم صاحب ہی کا خاندان گورنمنٹ کا شکرگزار نہیں ہوا بلکہ ہندوستان کے عام باشندے ہمیشہ اُس کے احسانمند رہیں گے۔

(اس کے بعد مولانا نے فرمایا کہ) "میں نے اس موقع کے لئے ایک قطعہ بھی لکھا ہے جس میں میں نے حکیم صاحب سے خطاب کیا ہے۔ چونکہ حکیم صاحب اس وقت تشریف فرما نہیں ہیں، اس لئے میں نواب فیض احمد خاں صاحب ہی کو حکیم صاحب کا قائم مقام فرض کر لیتا ہوں۔"

حاذق الملک! اس خطابِ فرخ و مسعود پہ — ایک عالم آپ کو دیتا مبارکباد ہے
پر یہ ہے کیسی مبارکباد؟ ہم حیران ہیں — گو کہ دل ہر اپنے بیگانے کا اس پر شاد ہے
سعی و کوشش آپ نے کی تھی کبھی بہرِ خطاب؟ — یا کوئی درخواست دی تھی آپ نے کچھ یاد ہے؟
یہ تو یاروں کی دعاؤں کا ہے بس سارا ظہور — غیب سے یاں ان دعاؤں کی ہوئی امداد ہے
پس مبارکباد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام — مستحق ہیں اس کے ہم یا آپ؟ کیا ارشاد ہے؟

تقریظات

تاریخ ہندوستان

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۵ء صفحہ ۳۸۲)

خان بہادر شمس العلما مولانا ذکا ءاللہ مرحوم نے منجملہ سینکڑوں کتابوں کے ایک ہندوستان کی نہایت مفصل تاریخ بھی لکھی ہے جو ۱۶ ضخیم جلدوں اور تین علٰحدہ علٰحدہ حصوں پر منقسم ہے۔ مولانا کا یہ ریویو تاریخ مذکور کے حصہ دوم متعلق بہ عہد مسلمانان پر ہے۔

عنوان پر جو نام کتاب کے ساتھ اُس کے نامی گرامی مصنف دام بقائہٗ کا نام نامی ثبت کیا گیا ہے، اس سے ناظرین بانمکین سمجھ گئے ہوں گے کہ کتاب کی عظمت و جلالت کس درجہ کی ہو گی، اور ملک میں اُس کی مقبولیت کس حد تک پہنچنے والی ہو۔ کیونکہ مصنف ممدوح اور اس کی بیشمار کتابوں نے جو شہرت اور نیکنامی تمام اقطاع ہندوستان میں حاصل کی ہو اُس سے یہ بات خوب ثابت ہو گئی ہے کہ اس واجب التعظیم آدمی کی تصنیفات آج کل ملک کے حق میں اکسیر اعظم کا حکم رکھتی ہے۔ یہ کتاب اصل میں تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ہندوؤں کے قدیم زمانہ کا حال ہے۔ اور یہ حصہ منطبع ہو کر ۱۸۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے حصے میں مسلمانوں کی سلطنت کا حال ہے۔ یہ ابھی چھپ کر تیار ہوا ہی اور ہمارا ریویو زیادہ تر اسی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرے حصے میں سلطنت انگلشیہ کا بیان ہے، یہ حصہ ابھی اختتام کو نہیں پہنچا مگر امید ہے کہ شروع ۱۸۷۶ء میں چھپ کر شائع ہو جائیگا۔ اس کتاب سے پہلے کوئی تاریخ کسی مشرقی زبان میں ایسی نہیں لکھی گئی جو ہندوستان کی تمام سلطنتوں پر حاوی ہو، بلکہ الفنسٹن کے سوا کوئی ایسا ترجمہ بھی دیسی زبان میں نہیں ہوا۔ پس اس ضروری تصنیف سے ہمارے ملک کی کتابوں کی صرف مقدار ہی نہیں بڑھی بلکہ

ہماری ایک ایسی شدید ضرورت رفع ہوئی ہے جس کا رفع کرنا مصنف جیسے روشن ضمیر اور جوانمرد آدمی کے سوا اوروں سے سخت دشوار تھا۔ اگرچہ فارسی زبان میں بعض تاریخیں مثل تاریخِ فرشتہ اور سیر المتاخرین وغیرہ کے ایسی بھی لکھی گئی ہیں جو بہ نسبت اور کتابوں کے کسی قدر جامعیت رکھتی ہیں، مگر اس زمانہ کا ایک شائستہ محقق اُن کے مطالعہ سے ہرگز اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ ہندوؤں کے قدیم زمانہ کے واقعات حال ہی میں یورپ کے ایسے مورخوں نے ایسے ذریعوں سے دریافت کئے ہیں جو قدر و قیمت میں ایشیا کے کشف و کرامات سے زیادہ گراں بہا ہیں۔ مثلاً آثار قدیمہ، پرانے کتبے، پرانے سکے، حملہ آوروں کی تحقیقات، ہندوؤں کی مذہبی کتابیں، علم تطابق السنہ مختلف قوموں کے خط و خال کی مطابقت وغیرہ۔ جو مراتب ان گراں وزن وسائل سے منکشف ہوئے ہیں اور جن کی بدولت ہندوؤں کی قدیم زمانہ کی تاریکی بہت کچھ رفع ہوئی ہے، اُن سے فارسی تاریخیں بالکل معرا تھیں اور اس کے سوا عہد انگلشیہ کی تاریخ آجتک کسی دیسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ پس یہ کتاب ان دونوں فائدوں کے لحاظ سے ہمارے ملک کی تاریخوں میں عدیم النظیر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی سلطنتوں کا حال جو اس مفید کتاب میں لکھا گیا ہے اُس کا عام ماخذ فارسی اور عربی کی بے شمار تاریخیں ہیں جو مختلف آدمیوں نے مختلف سلطنتوں کے حال میں قلمبند کی ہیں لیکن قطع نظر اس کے کہ مصنف نے اُن سب کی تلخیص کر کے اپنے ہموطنوں کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دیا، بڑی فوقیت اس کتاب میں یہ ہے کہ ہزاروں نکمی اور فضول باتیں جو مورخ کے ذہن کو جلا کرنے کی جگہ اور زنگ آلودہ کرتی تھیں اور عام تاریخ سے اصلا لگاؤ نہ رکھتی تھیں، جیسے اہلکاروں کا تقرر و تبدل، اُن کی ترقی، اُن کا تنزل، بادشاہوں کے حضور میں اہل دربار کی طرف سے پیشکش گذرنے، اہل دربار کو بادشاہوں کی طرف سے خلعت اور انعام یا القاب و خطاب ملنا، جشنوں کی تیاریاں، سیر و شکار کے سامان، شاعروں کی مدح سرائی، بھا

کی بٹائی، شہزادوں کی ولادت، شادیوں کی دھوم دھام، نجومیوں کا نیک ساعت بتانا، یا زائچہ اور پترا بنانا، جوگیوں کے ڈھکوسلے، نقیبوں کی لن ترانیاں، چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی سرکشی، سینکڑوں قصے اور افسانے خلاف قیاس وغیرہ۔ ان سب باتوں سے یہ کتاب بالکل پاک وصاف ہے۔ اور وہ بے بہا اور گراں قدر نتائج جو عام تاریخ کی جان ہیں اور جن سے ایشیائی تاریخیں قطعاً بے نصیب تھیں، اُن کے لحاظ سے مشرقی تاریخوں میں یہ پہلی ہی کتاب ہے جس میں یورپ کے روشن ضمیر مورخوں کا پورا پورا تتبع کیا گیا ہے۔ ہر ایک سلطنت کا اثر جو ملک پر یا ملک کا اثر جو سلطنت پر ہوا، اُس کا بیان، ہر ایک سلطنت کے زوال یا ترقی کے اسباب، ہر ایک بادشاہ کی خصلتیں اور اُس کا چلن اور رویہ، ہر موقع پر بر حسب ضرورت رائے لگانی اور اس میں تعصب اور طرفداری کو دخل نہ دینا، اس کتاب کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کی چھینٹ تک ہمارے ملک کی تاریخی کتابوں پر نہیں پڑی۔ تاریخی واقعات کو مصنف مدظلہ نے جس دلچسپ پیرایہ میں ادا کیا ہے اور پھر باوجود اس کے کہیں افراط وتفریط کو دخل نہیں دیا، یہ بات اگر محال نہیں تو تعجب انگیز ضرور ہے۔ ایک روشن ضمیر عالی دماغ آدمی نے اس کتاب کی نسبت یہ رائے دی ہے کہ اس میں ہر جگہ دو چار صفحوں کے بعد دس پانچ سطریں ایسی دلچسپ اور دلکش آتی ہیں جن کو پڑھکر با مذاق آدمی سر دھننے لگتا ہے۔ میں نے بھی اس کتاب کو جس قدر پڑھا اس میں بے شک یہ صفت پائی۔ بعض جگہ بے اختیار میرا جی بھر آیا اور بعض جگہ میرے دل میں جوش محبت پیدا ہوا، بعض جگہ اُس کے خلاف اثر ظاہر ہوا، بعضے مقام پر میری کسی قدیم رائے میں تذبذب واقع ہو گیا، اور بعضے موقع پر میری کسی رائے کو تقویت حاصل ہوئی۔ یہ باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تہ دل سے لکھا ہے کسی کی تقلید یا مخالفت سے اپنے دلی خیالات کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کیونکہ جو بات اور کے جی سے لکھی جاتی ہے وہ ایسی دلنشیں اور دل آویز ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جن بادشاہوں کو

یورپ کے تمام مورخوں نے ہدف تیر ملامت بنا رکھا ہے اور جوشِ تعصب میں اُن کے محاسن اور فضائل پر پانی پھیر دیا۔ اِس بے تعصب مصنف نے ان کی واقعی خوبیاں بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اگر کچھ ان پر اعتراض کئے ہیں تو کسی قدر اُن کی خوبیاں بھی تسلیم کی ہیں۔ اور جن بادشاہوں کو ہمارے بھولے بھالے سادہ لوح ہموطن ملکی خصائل سمجھے ہوئے تھے، اُن کے واقعی عیب بیان کرنے میں کسی کی نکتہ گیری کا اندیشہ نہیں کیا۔ ہماری دیسی زبان کی تاریخوں میں صرف الفنسٹن کا ترجمہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جس سے ہمارے عام ہموطن اِس تاریخ کے سے فوائد حاصل کرسکیں لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ آنریبل الفنسٹن صاحب نے جو مضامین مشرقی زبان سے اخذ کئے ہیں وہ انگریزی میں پورے پورے ادا ہوگئے، اور سائنٹفک سوسائٹی نے جو اس کا ترجمہ اردو میں کیا وہ بے کم و کاست لکھا گیا، (حالانکہ یہ دونوں باتیں مشکل سے تسلیم کی جاتی ہیں) تو بھی وہ ترجمہ اس کتاب کی برابری نہیں کرسکتا۔ اول تو یقیناً اس میں صدہا واقعات مندرج ہیں جن کا الفنسٹن میں کہیں پتہ اور نشان نہیں، حالانکہ مورخوں کے نزدیک جس نئی تاریخ میں تواریخ ماضیہ کی نسبت دو چار باتیں بھی نئی حاصل ہوسکیں وہ بے انتہا قدر کرنے کے لائق ہوتی ہے۔ دوسرے جب کوئی شخص کسی غیر قوم یا غیر ملک کی تاریخ اپنی مادری زبان میں لکھتا ہے تو اپنی زبان کی رعایت سے اس کو بالضرور مطلب نگاری میں ایسی روش اختیار کرنی پڑتی ہے جو غیر زبان والوں کو ہرگز مطبوع نہیں ہوسکتی۔ اور جب اس کا ترجمہ کسی تیسری زبان میں ہوتا ہے تو اس کی مثال بعینہ ایسی ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک یورپین آدمی جس کا باپ یورپین اور ماں ہندوستانی اور دودھ پلانے والی امریکن ہو۔ نہ اُس میں اصل زبان کی خوبی باقی رہتی ہے نہ دوسری اور تیسری زبان کا رنگ قائم رہتا ہے۔ تیسرے الفنسٹن صاحب کی کتاب پر جو تعصب کا الزام لگایا گیا ہے۔ وہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم تاریخ ہندوستان کی

واقفیت کا ذریعہ کسی ایسی کتاب کو ٹھہرائیں جس کا مصنف تعصب سے بالکل مبرا ہو پس ہم اپنے ہموطنوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُن کے ایک ہمدرد اور خیرخواہِ وطن نے اُن کے ملک کی قدیم اور جدید اور درمیانی زمانوں کے تاریخی حالات نہایت راستی اور درستی کے ساتھ تحریر کر کے اُن کے لئے ایک ایسا سرمایہ مہیّا کیا ہے جس کے وہ سخت ہی حاجتمند تھے۔ خاتمِ آلِ تیمور کی کی نسبت جو مصنف نے اپنی عادت کے موافق آزادانہ گفتگو کی ہے اور مناقبت کے ساتھ کسی قدر معائب بھی بیان کئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اُس نے واقع میں اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مگر مجھکو امید نہیں کہ ہمارے دیرینہ سال یا دیرینہ خیال ہموطن ایسی آزادانہ تحریر کو پسند کریں۔ ہمارے ملک پر ابھی آزادی کا پرچھاواں نہیں پڑا۔ ہم لوگ ہرگز نہیں چاہتے کہ جس شخص کو ہم میں سے سو پچاس آدمی کسی نیک صفت کے ساتھ متصف جانتے ہوں، اُس کی کوئی برائی واقعی یا غیر واقعی ہمارے سامنے بیان کیجائے۔ مثلاً جو شاعر ہمارے نزدیک مسلّم الثبوت ہے ضرور ہے کہ ہم اُس کے تمام کلام کو الہامی کلام کی طرح تمام عیوب سے پاک سمجھیں۔ اور مثلاً جس بادشاہ میں ایک رحم دلی کی صفت ہے، ضرور ہے کہ ہم اُس کو بلاتشبیہ انبیاء کی طرح معصوم جانیں۔ لیکن ہم مصنف کی طرف سے ایک جواب دیتے ہیں جس کو شاید پُرانی طبیعت کے لوگ بھی رد نہ کریں گے۔ ناظرین کا فرض ہے کہ اگر سب نہیں تو صرف سلاطین مغلیہ کا حال بابر سے لے کر بہادر شاہ تک اول انگریزی تاریخوں میں دیکھیں، پھر اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر انصاف کریں کہ اُن کے معزز ہموطن نے اپنے ملک کے اگلے بادشاہوں کو اہلِ یورپ کے مطاعن سے کس قدر بچایا ہے۔ اور جس قدر اُن کی برائیاں اُس نے تسلیم کی ہیں اُن کا تسلیم نہ کرنا اپنے تئیں مورخینِ صداقت آئین کے زمرہ سے خارج کر دینا تھا یا نہیں۔ ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی تاریخ اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں آئی کہ جس کو وہ چاہیں آسمان پر چڑھائیں اور جس کو چاہیں تحت الثریٰ تک پہنچا دیں۔ اب اس

تاریخ کی مالک وہ قوم ہے جس کے آگے بغیر حجت و دلیل کے کسی کی تعریف یا تنقیص پیش نہیں چل سکتی۔ جس شخص کے لئے اُنھوں نے پچاس عیب ثابت کئے ہیں ہم اُس کی کیسی ہی طرفداری کریں مگر اُس کے دس پندرہ عیب بے شک ماننے پڑیں گے، ورنہ ہم کو راستی سے ضرور ہاتھ اٹھانا پڑے گا۔

اقوامُ المسالِکؒ

یہ یورپ کی ایک مختصر تاریخ ہے جو دربارِ ٹیونس کے وزیر خیرالدین نے عربی میں لکھی تھی اور مولوی محمد اسمٰعیل نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا مگر آج کل یہ ترجمہ نایاب ہے۔

(از علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۵ء صفحہ ۶۳۵)

عرب سرائے کی علمی سوسائٹی نے مجھکو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ میں اس مفید کتاب کو اوّل سے آخر تک دیکھ کر اُس کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کروں اور یہ بھی لکھوں کہ اس کتاب کا ترجمہ کرانا اور اس کو چھپوا کر شائع کرنا ہندوستان کے حق میں کس قسم اور کس درجہ کے فائدے رکھتا ہے۔ اور اس پر کیا کیا نتائج مترتب ہونے کی امید ہے۔ اقوام المسالک کا مصنفِ عالی مقام ایک روشن ضمیر اور مدبرِ عالم سید خیرالدین احمد وزیرِ سلطنتِ ٹیونس ہے۔ جو علم وفضل اور عقل ودانش اور حدسِ صائب اور رائے سلیم کے سوا قومی ہمدردی کے نشے میں چور معلوم ہوتا ہے اور جس نے بنی نوعِ بشر کی خیرخواہی میں اپنی گراں بہا عمر کا ایک بڑا حصہ نہایت مفید طور پر صرف کیا ہے۔

ٹیونس افریقہ میں ملک بربر کے چار مختلف صوبوں میں سے ایک صوبہ ہے جس کا دار السلطنت خاص شہر ٹیونس ہے۔ اس شہر میں تقریباً ایک لاکھ آدمی رہتے ہیں جس میں چالیس ہزار یہودی اور باقی مسلمان عرب وغیرہ آباد ہیں۔ یہ صوبہ ممالک بربر میں بہت بڑی تجارت گاہ ہے۔ یہاں کے باشندے عموماً صاحب لیاقت اور شائستہ ہوتے ہیں۔ اور یہاں کا بادشاہ اپنے ملک میں اقتدار مطلق رکھتا ہے۔

یہ کتاب ایک نہایت طولانی مقدمہ اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ طولانی مقدمہ ساری

کتاب کی جان ہے اور اس سے جس قدر مصنف کی روشن ضمیری اور بالغ نظری ثابت ہوتی ہے اُس کا اندازہ کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ ہمارے ہموطنوں کے لئے عموماً اور ہمارے بھائی مسلمانوں کے لئے خصوصاً اس مقدمہ کا ایک ایک جملہ ناصح مشفق اور ہادی برحق کا کام دیتا ہے۔ اس میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جب کسی غیر مذہب قوم میں کوئی اچھی خصلت یا مفید بات پائی جائے اور لسانِ شرعی اُس کی تقبیح سے ساکت ہو تو ہم کو صرف اس خیال سے کہ ہمارے غیر مذہب والوں میں یہ بات پائی جاتی ہے اُس کے اخذ کرنے میں ہرگز تامل کرنا نہیں چاہیے۔ اس بات کی تائید کے لئے بہت سی عقلی اور نقلی دلیلیں پیش کی ہیں جن کے دیکھنے سے منصف مزاج آدمی کا شک بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ روایت بھی ذکر کی گئی ہے جس سے ثابت ہے کہ غزوۂ احزاب میں جو ہمارے نبیٔ برحق نے خندق کھودنے کا حکم دیا تھا وہ اہلِ فارس کا اتباع تھا اور اسی موقع کے مناسب کتاب سنن المهتدین نے ایک نہایت شافی قول نقل کیا ہے اور حاشیہ دُرِّ مختار میں جو علامہ عصر شیخ محمد بن عابد حنفی نے تصریح فرمائی ہے، وہ بھی نقل کی گئی ہے یعنی یہ کہ "جن باتوں میں مخلوقِ خدا کی بہتری اور ترقی ہو اگر اُن کے کرنے میں ہم کسی غیر ملت قوم کے ساتھ مشابہ ہو جائیں تو کچھ خرابی نہیں ہے"۔ اس کے بعد مصنف عالی مقام نے ایک نہایت لطیف بات لکھی ہے جس کو یہاں نقل کئے بغیر میں ہرگز نہیں رہ سکتا۔ یعنی یہ کہ "بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ فرنگیوں کی باتوں کے اتباع سے سخت انکار کرتے ہیں وہ اپنی بھلائی کی باتوں میں تو انکار کرتے ہیں اور جو باتیں اُن کے حق میں مضر ہیں اُن میں اُن کی مشابہت سے کچھ ان کو انکار نہیں۔ مثلاً وہ لوگ صریح فرنگیوں کا بنا ہوا کپڑا پہن کر خوش ہوتے ہیں اور انھیں کا بنا ہوا اسباب گھروں میں رکھتے ہیں اور انھیں کے بنائے ہوئے ہتھیار اور ضرورت کی چیزیں استعمال میں لاتے ہیں، مگر اُن چیزوں کو خود تیار کر کے کام میں لانے سے بڑا پرہیز کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے پرہیز کرنے میں اُن کے ملکی انتظام اور ملکی ترقی

دونوں میں بڑا نقصان اور خرابی پڑتی ہے " اس مضمون سے ہماری قوم (بشرطیکہ اُس کے اوبار کے دن پورے ہوگئے ہوں) بہت کچھ عبرت حاصل کر سکتی ہے کیونکہ جس تعصب نے اُن کو یہ روز سیاہ دکھایا ہے اور اس پستی اور تنزل کی حالت کو پہنچایا ہے ، یہ مضمون اُس کی جڑ کاٹنے والا ہے ۔اس کے بعد خود مختاری اور شخصی حکومت کے بُرے نتیجے اور جمہوری اور محدود الاختیار سلطنتوں کی خرابیاں اس شرح وبسط اور لطف وخوبی اور حجت و برہان کے ساتھ بیان کی ہیں کہ اب سے پہلے کسی مشرقی زبان کی کتاب میں نہیں لکھی گئیں ۔چونکہ تمام اشیاء کی کما ہی حقیقت اُن کی اضداد کے مقابلہ سے معلوم ہوتی ہے ۔ اور ہمارے ہموطنوں نے آنکھ کھولکر ایک آزاد گورنمنٹ کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور شخصی حکومتوں کے جور نہیں اُٹھائے ، اس لئے امید کیجاتی ہے کہ وہ اس مضمون کو دیکھ کر انگریزی گورنمنٹ کی قدر کما حقہ پہچانیں گے اور جو دولت (یعنی آزادی) خدا تعالیٰ نے اُن کو بن مانگے دے رکھی ہے ، اُس کا شکریہ دل سے ادا کریں گے ۔اس کے بعد مسلمانوں کو جو ثروت اور شان وشوکت اور علمی وعملی فوقیت زمانۂ سابق میں تمام دنیا کی قوموں کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے ۔گویا غیرت مند مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلائی ہے کہ افسوس وصد ہزار افسوس جس اولوالعزم قوم نے مشرق سے مغرب تک علم وحکمت کی روشنی پھیلائی اور جنھوں نے حسب شہادت وزیر اعظم فرانس اہل یورپ کو جہالت کی تاریکی اور ظلمت سے نکالا اور جن کی بدولت بغداد وبصرہ سے لے کر مصر اور فارس تک اور سمرقند سے لے کر غرناطہ اور قرطبہ تک اکثر بلاد یورپ و ایشیا و افریقہ مرکز علوم وفنون قرار پائے اور جن کی استادی اور حق تربیت کو آج تک یورپ کے منصف مزاج مورخ مانتے چلے آتے ہیں ، اُن کی اولاد ایسی وحشت اور تاریکی کے گڑھے میں اتر جائے جس میں سے نہ آپ اُبھر سکے نہ کسی کی مدد سے ابھرنے کا ارادہ کرے ۔

اس کے بعد اہل یورپ کی تحقیقات اور ایجادات کا بیان اور فرانس میں تعلیم اور تعلم کے طریقے ، وہاں کے کتب خانوں کی کثرت اور اُن کے عمدہ انتظام ، امیر زادوں

کی تعلیم اور انواع و اقسام فنون میں اُن کا ترقی کرنا، لفظ آزادی کی شرح، یورپ میں موجد اور مخترع لوگوں کے حقوق کا بیان اور ان کے سوا اور بے شمار مضامین نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہمارے ہموطن اپنے یورپ کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں تو اس بات کا اقرار کر سکتے ہیں کہ فی الحقیقت ہماری موجودہ حالت اہل یورپ کی حالت کے ساتھ وہ نسبت رکھتی ہے جو ڈھور اور ڈانگروں کو انسان کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد پہلا حصہ شروع ہوتا ہے جس کے بیس باب ہیں اور ہر ایک باب میں یورپ کی ایک ایک سلطنت کا حال مندرج ہے۔ ہر سلطنت کی تاریخ اور اس کی وسعت وحدود اور اُس کے اصول و قوانین اور طریقۂ سیاست اور طرز انتظام اور رعایا کی حالت اور ہر ایک کی مالی اور جنگی قوتیں اور محاصل کے ذریعے مثل زراعت اور نباتات اور معدنیات اور حیوانات اور تجارت اور صنائع وغیرہ اور بعض ابواب میں ان کے سوا اور خصوصیاتِ ملک کا نہایت کافی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ جغرافیہ ارض اور اقسام کرۂ زمین کے بیان میں ہے۔ اور اخیر میں ایک جدول ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت دریافت کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ دونوں حصے بھی عام ہندوستانیوں کے حق میں جنھوں نے انگریزی تعلیم نہیں پائی ایک خزانۂ غیبی کا حکم رکھتے ہیں۔ کیونکہ آج تک کوئی کتاب ہماری دیسی زبانوں میں ایسی نہیں لکھی گئی ہے جس میں یورپ کی تمام سلطنتوں اور اقسام کرۂ زمین کا حال مجملاً یا مفصلاً لکھا گیا ہو۔

اس کتاب کی تعریف میں بالاجمال صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جس نے ہمارے ملک اور ہماری قوم پر شائستگی کا دروازہ کھولا ہے۔ اور اگر ہماری افسردہ طبیعتوں میں کسی قدر قابلیت کا مادہ ابھی تک باقی ہے تو یہی کتاب ہماری شائستگی کی از سر نو بنیاد ڈالنے کے لئے کافی و وافی ہے۔ ہم کو سب سے پہلے مصنفِ عالی مقام کا شکریہ

ادا کرنا چاہیئے جس نے ہمارے اور ہمارے تمام بنی نوع کے لئے ایسی شمع ہدایت روشن کی۔ من بعد جناب مستطاب نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو کا شکر گذار ہونا چاہیئے جنھوں نے کلکتہ کے سفر میں یہ گراں مایہ جواہر بہم پہنچا کر مجلس خزینۃ البضاعۃ میں ہدیۃً پیش کیا۔ بعد ازاں اُس ہوا خواہِ ملک اور جاں نثارِ قوم کا شکر یہ بھی بقدرِ طاقت ادا کرنا ضرور ہے جس کے احسانات سے ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے یعنی سید القوم اور خادم القوم جناب مولوی سید احمد خان بہادر سکرٹری مجلس خزینۃ البضاعۃ جنھوں نے اس کتاب کو قوم کے حق میں نافع سمجھ کر اپنے اخبار گوہر بار کے ذریعہ سے بار بار اس کی خوبیاں جتائیں اور قوم کے دلوں کو اس کے مطالعہ یا اشاعت کی طرف مائل کیا۔ اور سب سے زیادہ ہمارے شکر کا استحقاق اُس ذات فیض آیات کو ہے جنھوں نے محض رفاہِ قوم کے لئے اپنی جیبِ خاص سے ایک گراں مقدار رقم صرف کر کے اُس کے ترجمہ کرانے اور چھپوانے اور رواج دینے میں کوشش بلیغ مبذول فرمائی اور ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کر دئے۔ یعنی جناب خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب وزیر اعظم ریاست پٹیالہ جنھوں نے قوم کی ہمدردی کا بیڑا اٹھا کر بہت کچھ کر دکھایا اور ابھی قوم کو اُن سے بہت کچھ امیدیں باقی ہیں۔

یہاں تک جس قدر میں نے لکھا وہ اصل کتاب اقوام المسالک سے تعلق رکھتا تھا۔ نظم الممالک ترجمہ اقوام المسالک کی نسبت ابھی میں نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ ترجمہ جناب خلیفہ صاحب ممدوح کے ارشاد سے جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اڈیٹر اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ نے عربی سے زبان اُردو میں تحریر فرمایا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح کی لیاقت اور علم و فضل اور سلیقۂ وقائع نگاری اور متانت اور سنجیدگی کمال شہرت اور بلند آوازگی کے سبب کسی کی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔ اس ترجمہ کے حق میں کوئی ستائش کا کلمہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا لکھنے والا وہ ذی لیاقت شخص ہے جس کے حسنِ

اہتمام سے سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ کا عدیم النظیر اخبار نکلتا ہے۔ اگرچہ اقوام المسالک جو عربی زبان میں ہے وہ آج تک ہماری نظر سے نہیں گذری اور کسی ترجمہ کی نسبت صحیح صحیح رائے اسی وقت دیجا سکتی ہے جبکہ اصل کتاب پیش نظر ہو، مگر جو مراحل دشوار گذار اُس واجب التعظیم مترجم کو طے کرنے پڑے ہوں گے اُن کو میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ عربی قدیم کا ترجمہ اردو میں کرنا کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ اور اسی طرح انگریزی کا ترجمہ کرنا بھی چنداں دشوار نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ عربی قدیم کی متعدد فرہنگیں اور انگریزی کی بیشمار ڈکشنریاں موجود ہیں۔ ہاں مگر زمانۂ حال کی عربی کا ترجمہ کرنا ایک ایسا دشوار کام ہے جس سے عہدہ برا ہونا محال معلوم ہوتا ہے، علی الخصوص جبکہ زمانۂ حال کی عربی میں کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جو سرتاپا مغربی خیالات سے بھری ہوئی ہو۔ زمانۂ حال کی عربی میں ہزاروں لغات مولّدہ ایسے شامل ہوگئے ہیں جن کا صحاح و قاموس وصراح میں کہیں پتا نہیں۔ اس کے سوا کئی الفاظ عربی حال میں اس قدر مخلوط ہیں جیسے اردو میں عربی یا فارسی الفاظ ملے ہوئے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ دقت واقع ہوئی ہے کہ ہزاروں الفاظ انگریزی اور فرانسیسی اور لاطینی اور یونانی زبان کے اہل مصر اور اہل روم نے معرّب کرکے اپنی زبان میں داخل کر لئے ہیں۔ ان الفاظ کی صورت اپنی اصلی ہیئت سے اس قدر متجاوز ہوگئی ہے کہ اُن کا سراغ لگانا سخت دشوار ہے، نہ عربی لغات میں انکا وجود ہے نہ انگریزی ڈکشنریوں میں ان کا نشان ہے۔ ان تمام وجوہ سے اُس دقت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اقوام المسالک کے ترجمہ میں مترجم صاحب کو پیش آئی ہوگی۔ با اینہمہ عام ترجمہ کمال خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگرچہ ظاہرا بعض مضامین میں ایک نوع کی پیچیدگی اور فی الجملہ الجھاؤ پایا جاتا ہے، مگر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضامین فی نفسہ دقیق اور پیچیدہ ہیں جن کے پورا پورا ادا کرنے سے ہمارے ملک کی ادھوری زبان قاصر ہے۔ بعض مقام پر جو جناب مولوی سید احمد خاں بہادر نے اپنے قلم سے حواشی تحریر فرمائے ہیں، وہ نہایت گراں قیمت

ہیں۔ اس ترجمہ میں ایک امر تنقیح طلب ہے جس کے ذکر سے قطع نظر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا جو کتابیں فی زمانا مصر وغیرہ میں مغربی زبانوں سے ترجمہ ہوتی ہیں یا اہل مغرب کے طریقہ پر لکھی جاتی ہیں، ان کی نسبت ہندوستانی مترجموں کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ انگریزی یا فرانسیسی الفاظ جو اہل مصر وغیرہ نے معرب کر کے اپنی تصانیف میں داخل کئے ہیں جب اُن کا ترجمہ اُردو میں کیا جائے تو اُن کو اُسی تعریب کی حالت پر رکھنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ تابمقدور اُن کو اپنے اصل کے موافق لکھنا چاہیئے۔ میری رائے میں پچھلا قول بہ نسبت پہلے کے اقوی ہے اور دلیل اس کی قوت کی ظاہر ہے۔ لیکن اس ترجمہ میں زیادہ تر قولِ اول کے مطابق عمل کیا گیا ہے، اور اس سے جو دقتیں ناظرین کو پیش آتی ہیں، اُن کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ آدمیوں اور مقامات اور جزائر وغیرہ کے بیشمار نام جو اس ترجمہ میں لئے گئے ہیں وہ ناظرین کو نہایت تشویش میں ڈالتے ہیں۔ ہندوستان کا آدمی کیسا ہی جغرافیہ داں ہو، ان اسما کو سن کر بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ چند مثالیں جو اس وقت ہمارے ذہن میں حاضر ہیں، یہاں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً میونیشیا کی جگہ میانس، سینٹ ٹامس کی جگہ سان توماس، سینٹ برنارڈ کی جگہ صان برنار، سینٹ ہلینا کی جگہ صانت الان، آگسٹس کی جگہ اغطوس، پوپ لیو دسویں کی جگہ بابا لیون عاشر، پوپوں کی جگہ بابوات، کرسٹوفر کولمبس کی جگہ . . . کولومب، جزائر مارشس کی جگہ جزائر موریس، سینگال اور گنی کی جگہ سنیغال اور غنی۔ اس قسم کے الفاظ اگر بالاستیعاب لکھے جائیں تو ایک جدا مجلد مرتب ہو جائے۔ پس میری رائے یہ ہے کہ طبع ثانی میں ضرور اس کی ترمیم کی جائے۔ اگرچہ اس درستی میں کسی قدر دقت بیشک اٹھانی پڑے گی مگر جو فوائد اس کتاب کے ترجمہ سے مقصود ہیں وہ خاص و عام کو برابر اور بے تکلف پہنچیں گے۔

نیرنگِ خیال

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۰ء صفحہ ۳۶۱)

اس کتاب کے مصنف ان قابلِ ادب شخصوں میں سے ہیں جن کی تصنیفات نے تمام سررشتۂ تعلیم پنجاب کو اپنا احسان مند کیا ہے اور جن کے مضامین اور خیالات سے اہلِ پنجاب نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اگرچہ کسی ملک یا کسی قوم میں اہلِ کمال کا نفسِ وجود ہی اُس ملک یا اُس قوم کا فخر کا باعث ہوتا ہے لیکن حقیقت میں فخر انھیں لوگوں پر کرنا بجا ہے جو اپنے ہنر اور کمال کی روشنی سے اپنے وطن یا قوم کو منور کرنا چاہتے ہیں اور اُن سے بھی زیادہ واجب التعظیم وہ لوگ ہیں جو اپنی بیش بہا کوششوں کا ثمرہ یقیناً اپنی زندگی میں نہیں پا سکتے اور پھر بھی کوشش کئے جاتے ہیں۔ وہ اُس مجلس میں جہاں مرہٹی اور بارہ ماسے کے شوقین جمع ہیں دُھرپت اور خیال الاپتے ہیں، مگر ان کی الاپ اس وقت پیاری معلوم ہوگی جب ایسی ایسی کئی مجلسیں برخواست ہو جائینگی۔ اگرچہ ہمارے ملک کے تمام علوم و فنون نہایت پستی کی حالت میں ہیں مگر ہمار اعلم انشا سب سے زیادہ تاسف کے قابل ہے۔ آج تک ایک ایسی ڈکشنری بھی جو عام ہندوستانیوں کے لئے مفید اور زبان کے ضروری حصہ پر حاوی ہو تیار نہیں ہوئی۔ آج تک ایک ایسی گرامر بھی جس میں نہایت ضروری قواعد منضبط ہوں نہیں لکھی گئی۔ جبکہ یہ ابتدائی مراتب بھی اب تک طے نہیں ہوئے تو اور باتوں کا کیا ذکر ہے۔ نظم میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ اس قدر محدود ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور جو خیالات اُن الفاظ کے ذریعے سے ادا کئے جاتے ہیں، وہ چند معمولی فرسودہ اور بوسیدہ مضامین کے سوا کچھ نہیں۔ نثر میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے وہ انھیں دس بارہ برسوں میں ہوئی ہے

لیکن زیادہ تر اُس کا پھیلاؤ عرض وطول میں ہوا ہے، ارتفاع میں وہ ویسی ہی پست ہے جیسے ہمارے مکانوں کے تلیچے۔ تاریخ، تذکرہ، قصہ، مثنوی، غزل، قصیدہ اور اور تمام اقسامِ نظم ونثر کی قدیم روش میں کوئی تغیر اس سے زیادہ نہیں ہوا کہ بعض لوگ اگلی روِش کو ناپسند کرنے لگے ہیں۔ مگر یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص بہلی اور چھکڑے پر ہنستا ہے مگر کوئی نمونہ ایسا نہیں دکھاتا جس کے آگے بہلی اور چھکڑا عام لوگوں کی نظر سے خود بخود ساقط ہو جائے۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں ایسا نمونہ دکھانا اور اس کو پسند خاص وعام کے لائق بنانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مصنف نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ کام اعلیٰ درجہ کے انگریزی تعلیمیافتہ لوگوں سے سرانجام ہوگا، مگر میری رائے بالکل اس کے برخلاف ہے۔ میرے نزدیک جب تک ہمارے اہلِ وطن مغربی علوم اور مغربی لٹریچر اپنی دیسی زبان میں نہ سیکھیں گے، کبھی اُن کے خیالات میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ فرض کرو کہ ایک باغ میں تمام دنیا کی نباتات اور گل بوٹے فراہم کئے گئے ہیں اور اس کا اصلی مقصد علم نباتات کی تحقیقات ہے، لیکن اگر اُس باغ کی ترتیب اور آرائش اور صفائی بھی ایسے نرالے ڈھنگ کی ہو کہ کبھی ہماری نظر سے نہیں گذری تو ہم کبھی اُس کے اصلی مقصد تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ہماری سیر اور نظر اُس کی بیرونی نمائش اور عجوبگی میں محدود رہے گی۔

انگریزی زبان جو ہماری زبانوں سے بون بعید رکھتی ہے اُس کے الجھاؤ ایسے نہیں ہیں جو طالب علم کو زبان کے پیچ وخم سے آگے بڑھنے دیں۔ وہ لغات اور محاورات کی تفتیش اور تجسس میں ایسا مستغرق رہتا ہے کہ مغربی خیالات جو انگریزی زبان کی جان ہیں اُس کی طبیعت پر اپنا رنگ نہیں جما سکتے۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے آج تک کسی اپنے ہموطن بی۔اے یا ایم۔اے کی کوئی تصنیف وتالیف جو اس کی عالی دماغی یا وسعت خیال پر گواہی دیتی ہو یا ملک کے حق میں کوئی معتد بہ فائدہ رکھتی ہو نہیں دیکھی۔ برخلاف

اُس کے امن لوگوں نے جن کے دامن انگریزی زبان کی خار دار جھاڑیوں میں نہیں اُلجھے (یعنی جنھوں نے انگریزی زبان کو انگریزی انشا میں کمال حاصل کرنے کے لئے نہیں سیکھا) یا جن کے دماغ میں مغربی خیالات کی لپٹ کسی مشرقی زبان کے ذریعہ سے پہنچی ہے، اپنی تصانیف اور تراجم سے اہلِ وطن کو اس قدر فائدہ پہنچایا ہے کہ جس قدر روشنی آج عام ہندوستانیوں میں عام پائی جاتی ہے، وہ اُنھیں کی بدولت پائی جاتی ہے۔

مصنفِ نیرنگِ خیال (دام بقاہم) بھی انھیں واجب التعظیم لوگوں میں سے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ ان کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے کہ جس قدر واقفیت کا سرمایہ فراہم ہو وہ وقتاً بعد وقتٍ اہلِ وطن کی ضیافتِ طبع میں صرف ہوتا رہے۔ جس قدر اُن کے افادات کتابوں اور رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ سے شائع ہو چکے ہیں ہمارے قیاس میں اُن سے وہ چند اُن کے پاس مرتب اور تیار رہوں گے جو اہلِ وطن کی بے پروائی اور نا قدردانی کے سبب سے اب تک شائع نہیں ہوئے۔ مگر جب تک ہمارے ہموطنوں کے کانوں میں داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کی صدائیں بھری ہوئی ہیں ایسی نا آشنا آوازوں کو کون سنتا ہے ؎

مشامت اختلال آباد بوئے سیر و انگوزہ — شمیمِ مشک و بوئے عنبر سارا چہ میدانی

یہ کتاب جس وقت ہمارے ہاتھ میں آئی، ایک ہی جلسہ میں دو ثلث سے زیادہ دیکھی گئی۔ جو ذوق اور خوشی ہم کو اس کے دیکھنے سے ہوئی وہ ہم کو مصنف کی شکر گذاری پر مجبور کرتی ہے۔ اب تک اکثر علوم کی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ طبیعیات، کیمسٹری، طب، فلسفہ، منطق، ریاضی کی تمام فروعات، ہیئت، حرکت و سکون وغیرہ وغیرہ بقدرِ ضرورت ہماری دیسی زبان میں موجود ہیں بہت ضروری تاریخیں اور کچھ ناول بھی ترجمہ ہوئے ہیں۔ جغرافئے بھی لکھے گئے ہیں مگر مغربی شاعرانہ خیالات کی جھلک تک آج تک ہندوستانیوں نے نہیں دیکھی تھی۔ نیرنگ خیال

پہلی ہی کتاب ہے جس نے اس سربستہ قفل کو کھولا ہے اور اہل وطن کے لئے علم انشا کی ترقی کا ایک نیا رستہ نکالا ہے۔ یہ کتاب دیباچہ کے علاوہ نو اسیز یعنی جواب مضمونوں پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسب تفصیل ذیل ہیں:۔

(۱) اُردو اور انگریزی انشا۔ (۲) آغاز آفرینش میں دنیا کا کیا رنگ تھا اور پھر رفتہ رفتہ کیا ہو گیا؟ (۳) سچ اور جھوٹ کی لڑائی (۴) امید۔ (۵) سیر زندگی۔ (۶) انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا۔ (۷) علوم کی بدنصیبی۔ (۸) علم اور ذکاوت کا مقابلہ۔ (۹) شہرت اور بقائے دوام۔ پہلے مضمون میں اول مطلق زبان کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ کیا چیز ہے اور اس کی ماہیت بہت سی تمثیلوں کے پیرایہ میں ظاہر کی ہے۔ پھر اردو میں جو قصور اور نقصان ہیں وہ بتلائے ہیں اور یہ جتایا ہے کہ زیادہ تر اُس کا قصور او نقصان اس سبب سے ہے کہ اس کو پیدا ہوئے ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں گذرے اور وہ سلطنت انگریزی کے عروج سے پہلے روزمرہ کی گفتگو کے سوا کسی کام میں نہیں آئی۔ مگر انگریزی حکومت کی ترقی کے ساتھ اُس نے بھی ترقی کرنی شروع کی اور اب جس قدر ہندوستان میں علوم کی ترقی ہو گی اُسی قدر زبان کو ترقی ہو گی۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ اصناف نوع بشر کے طبعی خیالات سب آپس میں متقارب اور متشابہ ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں دقت، غصہ، عشق، شہرت اور حسن کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ جن پیرایوں میں ان چیزوں کو اہل مغرب نے بیان کیا ہے انھیں کے قریب قریب مشرقی زبانوں میں اہل مشرق نے بیان کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر اُردو زبان کے علم انشا میں انگریزی لٹریچر کی چاشنی دیجائے تو کوئی بعید اور دشوار بات نہیں ہے اور اردو کی اصلی ترقی اسی بات پر موقوف ہے۔

دوسرے مضمون میں اول ابتدائے آفرینش کی خالص نیچرل حالت کا خاکا کھینچا ہے۔ دنیا کو ملک فراغ اور خسرو آرام کو اُس کا فرمانروا قرار دیا ہے۔ پھر فریب

کو جاسوس اور سینہ زوری کو شیطان اور لوٹ مار کو اُس کی ذریات قرار دے کر ملک فراغ کا خلل پذیر ہونا اور غرور و خود پسندی وحسد کا دخل پانا اور احتیاج کی گرم بازاری اور قحط و وبا کے صدمے اور ملکِ فراغ کے انتظام میں ایک نئی اصلاح کی ضرورت بیان کی ہے پھر دو تجربہ کاروں یعنی تدبیر اور مشورہ کی صلاح سے اہل عالم کا محنت پسند خردمند کے پاس جانا اور اُس کے حکم سے بسر کردگی ہمت وتحمل جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لینی اور تحصیل معاش میں سرگرم ہونا اور دنیا میں تمدن کی بنیاد پڑنی بیان کی ہے۔ پھر افراط محنت کے مضر نتیجے ویسی ہی محسوسات کی تمثیلوں میں لکھ کر انجام کو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دنیا میں جب تک آرام اور محنت دونوں اعتدال کے ساتھ نہیں رہتے تب تک صحت، خوشی اور جرأت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس مضمون کا اسلوبِ بیاں ہماری زبان کے قدیم اسلوبوں سے بہت کم ملتا ہے۔ اس میں معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور انسانی خصلتوں کے نیچرل خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایوں میں بیان کئے ہیں جن سے ہمارا لٹریچر بلکل خالی ہے۔ محنت و آرام میں اعتدال اور بے اعتدالی کے اچھے اور بُرے نتیجے اور آرام کے لئے محنت کی اور محنت کے لئے آرام کی ضرورت جس طرح پر کہ واقع میں ہے، اس مضمون کو پڑھ کر اُس کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی اسلوب پر اور تمام مضامین لکھے ہیں جن کے دیکھنے اور غور کرنے سے مغربی شاعرانہ خیالات کی بلندی اور وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا علم انشا آئندہ کہاں تک ترقی کرے گا اور مغربی خیالات کے فوٹو ہماری زبان میں کس درجہ تک خوبی کے ساتھ کھینچے جائیں گے۔ مگر ہمارے ملک کی موجودہ حالت میں نیرنگِ خیال ایک ایسا نمونہ ہے کہ اگر میری رائے غلط نہیں تو زمانۂ آئندہ میں اس کی قدر ہی نہیں بلکہ پیروی بھی کیجائے گی۔ اگرچہ اس وقت اہل وطن کے محدود خیالات اور ادھورے مذاق اور ناتجربہ کار آنکھ سے یہ امید

نہیں ہو کہ وہ مصنف کی کوشش کا پورا پورا اندازہ کر سکیں۔ وہ اُن دو کپڑوں کو جن میں سے ایک کل کے ذریعہ سے اور دوسرا دست و بازو کی محنت سے تیار ہوا ہو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُن دو آموں کے پھل ہیں جن میں سے ایک نے گرم سیر ملک اور دوسرے نے سرد سیر ملک میں نشو و نما پائی ہو، ایک ہی مزا ڈھونڈتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جو شخص ایک ایسی وسیع اور علمی شائستہ اور باقاعدہ زبان سے جیسے کہ انگریزی ہے شاعرانہ خیالات کو لے کر ایک ایسی محدود اور بے قاعدہ اور ناکامل اور غیر علمی زبان میں جیسی کہ اُردو ہے ادا کرتا ہو، اُس کی مشکلات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو واقعی اُس کا ہمدرد ہے۔

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را　　نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

اگرچہ اس عام قاعدے کے موافق کہ "الصفو والکدر توأمان" انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرا نہیں ہو سکتا خصوصاً تصنیف اور تالیف کا دشوار کام جس کا بے عیب ہونا محال ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کی برابر ہے۔ شاید ایک زمانہ ایسا بھی آئے جس میں زمانۂ حال کی عمدہ تصنیفات پر اسی طرح نکتہ چینی کی جائے جیسے آج کل ارسطو اور بوعلی کی تصنیفات پر کی جاتی ہے۔ مگر اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے خوض کرنا کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالاتِ اہلِ وطن کے اور کیا باعتبار مصنفوں کی امیدوں کے اور کیا باعتبار خوردہ گیری کی نیت کے ایک ایسا کام ہو جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔ پس اب ہماری یہ دعا ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی چھپ کر شائع ہو جائے اور ہمارے لٹریچر کی ترقی کے لئے یہ کتاب ایک مبارک فال ہو۔ آمین۔

آب حیات

(از علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابتہ ۱۸۸۱ء صفحہ ۹۲)

ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اُس وقت ملا جبکہ بہت سے اُردو اخباروں میں اُس پر ریویو لکھے جا چکے تھے اور اُس کے مضامین اور ابواب کی تفصیل اُن میں درج ہو چکی تھی۔ پس اب کوئی محل اس بات کا باقی نہ تھا کہ اُس کی نسبت کچھ زیادہ لکھا جائے مگر جو خاص کیفیت اُس کے دیکھنے سے ہمارے دل پر طاری ہوئی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اپنے ہموطنوں پر بھی ظاہر کریں۔ اس تذکرہ کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا۔ حق یہ ہے کہ یہ اُردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فرائض ادا کئے گئے ہیں۔ ہمارے تذکرہ نگاروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ شعرا کے نہایت ضروری حالات کے تجسس میں بھی کبھی کوشش نہیں کی گئی، یہاں تک کہ تاریخِ ولادت، تاریخ وفات، مولد، مسکن، قوم، خاندان، تعلیم، مشورۂ سخن وغیرہ کا بھی بہت کم ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ تمام ہمت اس بات میں صرف کی گئی ہے کہ اُن کا کلام جس قدر اپنے مذاق کے موافق پایا انتخاب کر کے لکھدیا اور اُن کی بے معنی اور لغو ستائش میں جس سے کلام اور صاحب کلام کی اصل حقیقت پر اور پردے پڑ جائیں، ورق کے ورق سیاہ کر دیئے۔ مصنف نے شعرا کے اُن ضروری حالات لکھنے ہی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ چند شخصوں کے سوا جن کے نشانِ قدم اگلے تذکرہ نویسوں کی بے پرواہی سے کسی قدر محو ہو گئے ہیں، ہر شاعر کے سوانح عمری جہاں تک ممکن تھا نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ اُس نے اُن کی تعریف میں وہ شاعرانہ مبالغے بھی نہیں کئے جن کا کچھ ثبوت نہ ہو بلکہ خود اُن کے وقائع ایسے لکھے ہیں جن سے اُن کی سیرت اور اخلاق پر استدلال ہو سکے۔ اس

نے اُن کے کلام اور شاعری پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور جا بجا اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے، مگر ادب اور تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور نہایت خوبی کے ساتھ اس دشوار گذار مرحلہ کو طے کیا ہے۔ وہ تاریخ اُردو کے مضمون میں پارسیوں، ہندوؤں اور بودھ مت والوں کا نام ایسے ادب سے لیتا ہے کہ ہمارے بھائی مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کا نام بھی ایسے ادب سے نہیں لے سکتے۔ مصنف نے اس تذکرہ کے اول میں دو مضمون زبان اُردو اور نظم اردو کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبان اُردو سے متعلق ہے، اُس نے انگریزی موّرخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کر کے مدد لی ہے اور پچھلا بڑا حصہ جو کہ اُردو، بھاشا، عربی اور فارسی زبانوں سے متعلق ہے وہ خاص مصنف کی بے انتہا اور بے بہا کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام مضمون نہایت مفید اور بصیرت افزا اور زبان کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مصنف سے اس باب میں کوئی ضروری بات فروگذاشت ہوگئی ہو تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو شخص سب سے اول کوئی تاریخی مضمون لکھتا ہے اُس کو ہزاروں پریشان باتیں فراہم کرنی پڑتی ہیں اور ممکن نہیں کہ کوئی ضروری چیز فروگذاشت نہ ہو جائے۔ لیکن ہم افسوس کے طور پر لکھتے ہیں کہ اُردو زبان کی ترقی کے بیان میں پرچۂ تہذیب الاخلاق کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس پرچہ نے اُردو زبان کو چند روز میں اس درجہ تک پہنچا دیا ہے جو کم سے کم پچاس برس کے بعد اس کو حاصل ہوتا۔ اُردو لٹریچر پر اس پرچہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ مذہب، اخلاق، معاشرت اور تمدن پر جو اعلیٰ درجہ کے مضامین اس پرچہ میں لکھے گئے ہیں انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُردو زبان کسی مطلب کے ادا کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ بلند خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں موثر طور پر بیان کرنا اسی پرچہ نے لوگوں کو سکھایا ہے اور اس فخر کا وہ ہمیشہ مستحق سمجھا جائے گا۔ نظم اُردو کی تاریخ کا مضمون بھی جسکو پہلے مضمون کا ضمیمہ کہنا چاہئے نہایت عمدہ ہے اسکی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ اُس میں نیچرل

شاعری کا ذکر جس کی بنیاد خود مصنف نے انجمن پنجاب میں ڈالی تھی قلم انداز کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں مصنف کی طرف سے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ اس طرز کی شاعری ابھی ایسی حالت میں ہے کہ اُس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ دوسرے جس چیز کی ہدایت خود مصنف سے ہوئی ہے اُس کا جتانا مصنف کے معاصرین کا حق ہے نہ کہ خود مصنف کا۔ اس مضمون کے اخیر میں مصنف نے میر انیس اور مرزا دبیر کو خاتمہ شعرائے اردو لکھا ہے، یہ اُس نے ایک نہایت انصاف کی بات لکھی ہے بلکہ میر انیس کا رتبہ ہمارے نزدیک اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ ہماری رائے میں اُردو شاعری کا پورا پورا اطلاق اگر ہو سکتا ہے تو میر انیس ہی پر ہو سکتا ہے۔ میر انیس پر نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ اُن سے زیادہ اہل دہلی کو فخر کرنا چاہیے، کیونکہ اُن کے بزرگ اسی معدن کے جواہر تھے۔ یہ مثل کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں" شاید اُس زمانے میں مشہور ہوئی ہو گی جبکہ مرثیہ گوئی کا آغاز تھا اور غزل اور مثنوی معراج کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ جیسے ہماری قوم میں اب سے بیس ۲۰ برس پہلے علوم قدیمہ کے سامنے علوم جدیدہ ہیچ دپوچ سمجھے جاتے تھے، لیکن اب روز بروز خیالات دگرگوں ہوتے جاتے ہیں۔ نظم اُردو میں نیچرل شاعری کا پتہ اگر ملتا ہے تو میر انیس ہی کے کلام میں ملتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ولی سے لے کر غالب تک شعرائے اردو کے پانچ طبقے کئے ہیں اور ہر ایک طبقہ کے نامور اور مستند شاعر (جو کہ اُس کے نزدیک مستند تھے) انتخاب کرلئے ہیں؛ اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومن یا میر نظام الدین خاں ممنونؔ لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فروگذاشت نہیں کیا جائے گا، بلکہ اُس نے ہر دورہ میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کرلئے ہیں اور اس سے اُن تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دورہ میں زبان اُردو پر واقع ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اردو کا حال

بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محل اعتراض تھا۔ شعرا کے ذکر میں مصنف نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ابتدا سے اخیر تک ہر ایک دورہ میں جو جو الفاظ متروک اور اُن کی جگہ جو جو الفاظ مستعمل ہوتے گئے وہ بھی بوجہ استیفا ذکر کئے جائیں اور شہادت کے لئے جا بجا ہر ایک دورہ کے شعرا کا کلام نقل کیا جائے۔ یہ کوشش نہایت تحسین و آفرین کے لائق ہے اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس میں کس قدر وقت اٹھانی پڑی ہوگی۔ پھر جہاں جہاں معاصرین کو ایک دوسرے سے توارد ہوا ہے، وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ہر ایک کا طرز بیان ایک ہی مطلب کے ادا کرنے میں کیسا تھا۔ اُس نے اور تذکرہ نویسوں کی طرح غزلوں کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ہر ایک شاعر کی سالم غزلیں لکھدی ہیں تاکہ ناظرین اُس کے عام خیالات کا اندازہ کر سکیں حقیقت میں یہ بات ٹھیک نہیں تھی کہ تمام شعرا کے کلام میں سے صرف ایک خاص طرز اور خاص روش کے مضامین انتخاب کئے جائیں اور ہر شخص کو مثلاً میر اور مرزا کا ہمپایہ ظاہر کیا جائے۔ لیکن ہمارے نزدیک عام خیالات ظاہر کرنے کے ساتھ (جیساکہ مصنف نے کیا ہے) یہ بھی ضرور ہے کہ ہر ایک شاعر کے اعلیٰ درجہ کے خیالات اور اچھوتے مضامین بھی دکھائے جائیں تاکہ اس کا مبلغ فکر اور رسائی طبیعت کا منتہا معلوم ہو اور اُس کے پُرکن اور پست خیالات بھی بطور نمونہ کے ظاہر کئے جائیں تاکہ اُس کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ کا حال اچھی طرح خاطر نشین ہو جائے۔ بظاہر اس تمام تذکرہ میں ۲۳ شاعروں کا حال قلمبند اور اُن کا کلام نقل کیا گیا ہے، لیکن تراجم شعرا کے ضمن میں جا بجا اُن کے معاصرین اور اُن کے ہم صحبتوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ہر موقع پر بہت دلچسپ نقلیں اور لطیفے ایزاد کئے ہیں۔ اور تمام حالات کے فراہم کرنے میں جو محنت اور جانکاہی مصنف نے کی ہے اُس کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ابتدائے سن تمیز سے ایک ایسی جامع کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا! در وقتاً فوقتاً جہاں جو سرمایہ ملا اُس کو احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہوگا۔ ورنہ ایسے تفصیلی حالات جو کتابوں میں درج نہ ہوئے ہوں اور صرف

افواہِ خلائق پر جاری ہوں، کسی طرح اس ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بہادر شاہ اول کے عہد سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے اخیر وقت تک کہ سلطنت مغلیہ کے عین تنزل کا زمانہ ہے تقریباً ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں، اس عبرت انگیز زمانہ کے ایک خاص عالم کی تصویر جیسی اس تذکرہ میں نظر آتی ہے، صفحاتِ تاریخ اُس سے معرّا ہیں۔ ان حالات کو زیادہ تر دہلی سے اور اُس سے کسی قدر کم لکھنؤ سے تعلق ہے۔ اکثر مقامات پر ان حالات کو پڑھ کر دفعتاً جی بھر آتا ہے اور زمانۂ گذشتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس کتاب کو مورخانہ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قومی ترقی کا ابتدائی ہنگامہ قابلِ دید ہوتا ہے اُسی طرح قومی تنزل کا ابتدائی تماشا دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ عالی خاندان مٹتے ہیں اور پست بلند ہوتے ہیں، امیرزادے منصب اور خدمت سے مایوس ہو کر پیشہ یا مزدوری اختیار کرتے ہیں، بعضوں کا دل دنیا سے سرد ہو جاتا ہے اور وہ لباس فقر پہن کر کوئی تکیہ آباد کرتے ہیں۔ جن فلک زدہ خاندانوں کو تلاش معاش میں رئیسوں اور دولتمندوں کے دروازے جھانکنے پڑتے ہیں وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہیں، ضرورت اور فلاکت یہ کہتی ہے کہ پیٹ کے لئے تمام مکروہات کو گوارا کیجئے مگر خاندانی غیرت جو ابھی طبیعتوں سے بالکل نیست و نابود نہیں ہوئی، ناگوار باتوں پر تحمل نہیں کرنے دیتی۔ اگر کہیں مقسوم سے قدم جم بھی جاتے ہیں تو اس کو قیام نہیں ہوتا، جہاں کوئی بات طبیعت کے خلاف دیکھتے ہیں فوراً بگڑ جاتے ہیں اور پھر اُدھر رُخ نہیں کرتے۔ خاندان تباہ ہو چکے ہیں، مگر خاندانی افتخار ایک ایک کے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ شرفا کے قافلے جوق جوق دلّی سے لکھنؤ کو چلے جاتے ہیں۔ جن کے باپ دادا دربار شاہی کے رکن رکین تھے اُن کی اولاد بادل شاہ اور شاہ تسلیم کے تکیوں میں دھونی رمائے بیٹھی ہے۔ جو عالیشان محلوں میں رہتے تھے وہ درختوں کے سایہ میں پڑے ایند رہے ہیں۔ جن لوگوں کا استقلال مہمات ملکی میں صرف ہوتا تھا اُن کی نسلوں کا استقلال اب خالی پھیکی وضعداریوں میں صرف ہوتا ہے۔ میر صاحب باایں ہمہ تقدس بی نورن کی

چوکھٹ کو ایک دفعہ روز سلام کر آتے ہیں۔ شاہ صاحب کا تکیہ ہے اور ہر روز سہ پہر کو شرفا و ادنیٰ کا جمگھٹا ہے۔ اُمرا کی سفلہ مزاجی سے اہل کمال کو مسخرگی اختیار کرنی پڑی ہے، وہ اپنا تمام علم و فضل اور ذہن و جودت اسی میں صرف کرتے ہیں۔ اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں جن کو اس کتاب میں دیکھ کر بے انتہا عبرت ہوتی ہے اور نیرنگیٔ روزگار کا ایک طرفہ تماشا نظر آتا ہے اگرچہ مصنف نے اپنی کتاب میں کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اُردو شاعری نے ہماری معاشرت، ہمارے اخلاق، ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا لیکن اُس نے شعرا کا حال ایسا واشگاف لکھا ہے کہ ہر صاحب رائے اُس کو دیکھ کر اس باب میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کی رفتار سرے ہی سے ایسی بے اصولی تھی کہ وہ جس قدر آگے بڑھتی تھی اُسی قدر منزلِ مقصود سے دور ہوتی جاتی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اُردو شاعری کا آغاز اور سلطنت مغلیہ کا زوال ایک ہی وقت سے شروع ہوتا ہے، گویا اُس کا بیج ایسی زمین میں بویا گیا تھا جس میں زراعت کی قابلیت نہیں رہتی تھی۔ شاعری کی اصلی ترقی کا مدار ملک کی عام شائستگی اور تعلیم پر ہے۔ کیونکہ شعرا کو جس قدر شائستہ اور نکتہ فہم مخاطب میسر آتے ہیں اُسی قدر اُن کے خیالات شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر زمانہ کو عربی میں "افصح المؤدبین" اور انگریزی میں "گریٹ رفارمر" کہا گیا ہے۔ دوسری چیز جو شاعری کو شگفتہ اور بارور کرتی ہے وہ قومی سلطنت ہے۔ جس ملک میں یہ دونوں صورتیں نہیں ہوتیں تو شاعری کی اصلی ترقی ناممکن ہوتی ہے۔ مگر شخصی سلطنت سے بھی اس کو بہت کچھ مدد پہنچتی ہے۔ شعرا کو ایک خاص جماعت کے مذاق کے موافق جو کہ دربار شاہی کے رکن رکین اور اپنے زمانہ کے علم و فضل و لیاقت میں سب سے ممتاز ہوتے ہیں، اپنے خیالات کی تہذیب اور اصلاح کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اکبری دورہ کی شاعری اس کی مصداق ہے۔ افسوس ہے کہ اردو شاعری نے اُس وقت جنم لیا جبکہ اُس کا کوئی مربی اور سرپرست نظر نہ آتا تھا۔ وہ دربار جو اردو زبان کا ملجا و ماوی تھا برخاست ہو چکا تھا عام

شائستگی و تعلیم جو ملک میں پہلے ہی سے نہ تھی۔ امرا میں بہت سے بگڑ چکے تھے اور جو کچھ باقی تھے اُن کے مذاق افراطِ عیش و عشرت کے سبب فاسد ہو گئے تھے۔ خواص کا گروہ جس سے اہل علم و فضل کی جماعت مراد ہے اپنی بے اقتداری سے اس قابل نہ تھا کہ شاعری کی بنیاد محض ان کے مذاق پر رکھی جاتی۔ غرض کوئی چیز ایسی نہ تھی جو شعرا کے خیالات کو تہذیب و شائستگی کی طرف کھینچتی۔ بلکہ دائیں بائیں تمام اسباب ایسے جمع تھے جو شاعروں کو بھاٹ اور مسخرہ بنانے والے یا مرض مالیخولیا میں مبتلا کرنے والے یا باہمی رشک و حسد کے باعث تھے۔ شعرا کو جن امیروں کے ہاں تعلق ہوتا تھا وہ یا تو علم و فضل اور مذاق سخن سے عاری یا عیش و نشاط میں منہمک ہوتے تھے اور اس لئے اُن کو سنجیدہ خیالات کبھی پسند نہ آتے تھے، بلکہ ہنسی اور چہل کی باتوں پر ہر طرف سے قرار واقعی داد ملتی تھی۔ ایسا ہی حال مشاعروں کا تھا کہ وہاں بھی فحش اور بے حیائی یا کسی کی ہجو پر جس قدر تحسین و آفرین کا غل ہوتا تھا، اُس کا عشر عشیر بھی ایک متین اور سنجیدہ کلام پر نہ ہوتا تھا۔ پھر چونکہ شعرا کے قدردانوں کا قحط تھا، اگر کسی کو قسمت سے کوئی ٹھکانا ملجاتا تھا تو وہ اس کو ایک فوزِ عظیم جانتا اور دوسرے شاعر کا وہاں رنگ نہ جمنے دیتا تھا۔ اسی بنا پر شاعروں میں باہم چشمکیں رہتی تھیں۔ بھرے مشاعروں میں ایک دوسرے پر اعتراض کرتا تھا، ایک دوسرے کی ہجو پڑھتا تھا، ایک دوسرے کی داد نہ دیتا تھا۔ شاگردوں کو حکم تھا کہ بھری محفلوں میں حریفوں پر چوٹیں کرو، قہقہے لگاؤ، اور موقع نہ ملے تو رموز و کنایہ میں خاکہ اڑاؤ۔ یہ بلا اس قدر پھیلی تھی کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا سوانگ بنا کر سر بازار نکلتا تھا، جہاں اُس کے ننگ و ناموس کی بے حرمتی کیجاتی تھی، اُس کی ہجو کے اشعار ڈنڈوں پر گائے جاتے تھے۔ شعرا کے باہم رشک و حسد کا یہ حال تھا کہ جس شاگرد کو ہونہار جانتے تھے اور خاص و عام کو اس کی طرف مائل دیکھتے تھے اس کے بتانے میں دریغ کرتے تھے اور اُس کو غلط اصلاحیں دیکر سر مشاعرہ ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ چند شاعر جو اعلیٰ درجہ کے قانع، مستغنی اور خوددار تھے اور سنجیدگی جن کی جبلت میں پیدا کی گئی تھی وہ بھی کوئی ایسی انوکھی روش اختیار نہ کر سکتے تھے جو

سراسر مذاقِ جمہور کے خلاف ہو۔ جیسے میر تقی علیہ الرحمۃ کہ اُن کا ایک شعر پڑھ کر بے اختیار منہ سے درد و نکلتا ہے اور دوسرا شعر پڑھ کر نہایت شرم آتی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری بگڑی اور خوب بگڑی اور اس کا اثر ہمارے اخلاق پر ایسا ہی ہوا جیسا ہوائے سمّی کا اثر صحت جسمانی پر ہوتا ہے۔ اس مطلب کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ اب ہم مصنف کی شکر گذاری پر اس ہذیان سرائی کو ختم کرتے ہیں جس نے اپنے بیش قیمت اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ صرف کرکے اہل وطن کے لئے ایک ایسی کتاب تیار کی ہے جو زبان کے محققوں کے لئے ہادی اور رہنما ہے، سیر و اخبار کے شائقین کے واسطے ایک داستانِ عبرت انگیز ہے، ظرافت پسندوں اور نوجوانوں کے لئے سامانِ خندہ و نشاط ہے اور اصحاب رائے کے لئے ایک مفصل روئداد ہے جس میں اردو شاعری کے فیصلہ کے لئے کافی شہادتیں موجود ہیں۔ اگرچہ وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ شائستہ ملکوں کی طرح ہر نئی تصنیف و تالیف پر ہمارے ہموطن بھی اس طرح گریں جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی پر گرتا ہے لیکن عمدہ اور مفید تصانیف کا حق ہے کہ اہل وطن دل و جان سے اُن پر متوجہ ہوں اور اُن کی قدر کریں اور مصنفوں کے شکر گذار ہوں۔

منطقِ استقرائی

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۱۸۸۲ء صفحہ ۱۰۲۸)

اس رسالہ کے مصنف قصبہ ہہم ضلع رہتک کے ایک بزرگ خاندان سے ہیں جن میں سے مولوی سید رمضان صاحب کا نام مسلمانوں میں اب تک تعظیم سے لیا جاتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب پنجاب کے مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایم۔ اے کا درجہ حاصل کیا ہے۔ باوجودیکہ ان کو کالج چھوڑے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور دو بڑے بڑے کام، ایک اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ و ریاضی کی تعلیم اور دوسرے اخبار انجمن پنجاب کی اڈیٹری اُن سے متعلق ہے، پھر بھی اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے کئی مفید کتابیں اردو میں تالیف اور ترجمہ کی ہیں، جیسے رسالہ علم سکون سیالات، رسالہ علم ہیئت، رسالہ سیاست مُدن، رسالہ اصول قانون اور یہ رسالہ جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ منطق استقرائی میں اس رسالہ سے پہلے کوئی تصنیف یا تالیف یا ترجمہ اُردو زبان میں چھپ کر شائع نہیں ہوا۔ اگرچہ منطق استقرائی کا موجد لارڈ بیکن کو قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ جیسا لارڈ مکالے نے بیان کیا ہے ارسطو نے بیکن سے دو ہزار برس پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ تحقیقات جدید اور نئے اصول دریافت کرنے کے لئے صرف منطق استقرائی ہی رہنما ہو سکتی ہے اور اُسی نے منطق قیاسی کو جس پر آج کل ہماری قوم کی فضیلت اور فلسفیت کا مدار ہے محض بے ثمر اور عقیم بتایا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ بیکن نے اُس کی سودمندی کو حد سے زیادہ بڑھا دیا اور جس لازوال دولت کی کان سے تمام دنیا غافل تھی اُس کی طرف سب کو متوجہ کر دیا جس طرح آج تک منطق قیاسی کو سرمایۂ فضیلت و استعداد سمجھتے ہیں اُسی طرح ایک زمانے میں یعنی لارڈ بیکن کی رہنمائی سے پہلے تمام یورپ میں یہی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اُسی بے بر اور بے ثمر منطق

پر تمام اہل مغرب قانع تھے جس پر بالفعل مسلمان قانع ہیں۔ سوائے لفظی بحث و تکرار اور نکمی تدقیقات کے کوئی نتیجہ اُن کے علم و فضل کا نہ تھا۔ مذہب رومن کیتھلک اور فلسفہ میں ویسا ہی رابطۂ اتحاد مستحکم تھا جیسا بالفعل اسلام اور ارسطو کی حکمت میں پایا جاتا ہے۔ مگر بیکن کی کتاب "نودم آرگینم" نے لوگوں کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور بجائے اس کے کہ ایک کولھو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک ایک دائرۂ معین سے آگے قدم نہ بڑھاتے تھے اب ترقی کی سیدھی اور غیر محدود سڑک پر پڑ لئے۔ یورپ کے تمام صنائع و فنون اور تمام تحقیقات اور انکشاف کی کنجی یہی منطق استقرائی ہے جس کی تشریح و تحلیل "نودم آرگینم" میں کی گئی ہے اور جس کا انکشاف ہندوستانیوں کے لئے سب سے پہلے مولوی محمد حسین ایم۔ اے کے ہاتھ اور قلم پر محوّل تھا۔ یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ اشیا اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ پس ہمارے ہموطنوں کے سامنے منطق قیاسی کی توہین اور تنقیص اُس وقت تک بکار آمد نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ منطق استقرائی کا کوئی عمدہ نمونہ اُن کے سامنے پیش نہ کیا جاتا۔ ہم کو مصنف ممدوح کا شکریہ دل و جان سے ادا کرنا چاہئے جنھوں نے یہ نمونہ اہل وطن کے لئے مہیا کیا اور اُن کو دونوں منطقوں کے مقابلہ کرنے کا موقع دیا ہے۔ کاش ہمارے ملک کے فضلا بھی اس گراں قدر کتاب پر ویسے ہی توجہ مبذول فرمائیں جیسے اہل یورپ نے "نودم آرگینم" پر کی تھی۔ اس رسالہ پر تھوڑی سی توجہ کرنے سے کم از کم یہ بات ضرور اُن کے ذہن نشین ہو جائے گی کہ جس درخت کو وہ ایک ہزار برس سے پانی دے رہے ہیں اُس سے نہ کبھی کسی نے پھل حاصل کیا ہے اور نہ اُس کے پھل لانے کی آئندہ توقع ہے۔ وہ جس قدر زیادہ پھیلے گا اُسی قدر اُس کی ٹہنیاں زیادہ خاردار ہوتی جائیں گی اور جس قدر اُس کے ریشے زمین میں دوڑیں گے اُسی قدر زمین کو خراب اور برباد کریں گے۔ اگرچہ اس رسالہ کی بنیاد غالباً کسی خاص انگریزی کتاب پر رکھی گئی ہے اور زیادہ تر کسی ایک ہی کتاب کے مطالب اس میں ترجمہ کیے گئے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مترجم موصوف نے بعض مفید باتیں اور

کتابوں سے بھی اخذ کی ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ جہاں تک کہ علمی مضامین کے بیان میں آسانی اور سہولت ہو سکتی ہے بہت صاف اور سلیس ہے۔ اگرچہ اس کے مطالب سمجھنے میں متستعد طالب علموں کو بھی کسی نہ کسی قدر تامل اور غور کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن علمی مسائل کا بیان اس سے زیادہ سہل اور آسان ہونا نہایت دشوار ہے۔ ہندوستان کے انصاف پسند فاضلوں کا اتفاق ہے کہ جس طرح تمام یورپ میں ہر علم کی اصطلاحیں خاص لاطینی اور یونانی سے لی گئی ہیں اسی طرح ایشیا میں بھی کوئی خاص زبان ایسی ہونی چاہیئے جس کی اصطلاحیں مشرق کی تمام علمی کتابوں میں داخل کیجائیں۔ مشرقی زبانوں میں صرف دو زبانیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے یہ غرض پوری ہو سکتی ہے، ایک سنسکرت اور دوسری عربی لیکن سنسکرت کا جاری ہونا عرب، شام، ایران، ترکستان اور افغانستان وغیرہ میں قریب محال کے ہے اور نیز علوم جدیدہ کی نئی اصطلاحیں بالفعل سنسکرت میں موجود نہیں ہیں۔ البتہ عربی زبان ایسی ہے جس کی اصطلاحیں ایشیا کے اکثر حصوں میں جاری ہو سکتی ہیں، اور نیز علوم جدیدہ کی بے شمار اصطلاحیں عربی میں وضع ہو چکی ہیں۔ اسی واسطے مصنف نے اس رسالہ میں عربی اصطلاحیں جو کہ مصر کے عربی ترجموں میں برتی گئی ہیں استعمال کی ہیں۔ اگرچہ وہ سردست کسی قدر اجنبی معلوم ہوں گی لیکن یقین ہے کہ بہت جلد وہ اردو زبان میں گھل مل کر ہمارے ہموطنوں کے کانوں سے مانوس ہو جائیں گی۔

رسالہ منتہی العروض

(منقول از منتہی العروض صفحہ ۳-۴)

فن شعر کے متعلق یہ کتاب دو چھوٹے چھوٹے رسالوں "منتہی العروض" اور "مثنوی تحفۃ الشعرا" پر مشتمل ہے۔ سید محمود صاحب خلف میر محمد صاحب مرحوم امام جامع مسجد دہلی اس کے مصنف ہیں۔ کتاب ۸۶ صفحہ پر ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

میں نے یہ مفید رسالہ بقدر ضرورت اور مثنوی تمام و کمال دیکھی اور پڑھی۔ فارسی میں اس فن کی متعدد کتابیں متداول ہیں جن میں سے بعض کو تمام اہل صناعت نے تسلیم کیا ہے۔ مگر بظاہر کوئی اردو کا جامع رسالہ خصوصاً پنجاب میں آج تک ایسا شائع نہیں ہوا جو عروض کی تمام ضروریات کو حاوی ہو یا ایسے ضبط و انتظام کے ساتھ لکھا گیا ہو جس سے اس فن کے وحشی اور اجنبی مسائل مستحضر کرنے میں طالب علم کو مدد ملے۔

جہاں تک رسالہ منتہی العروض کو میں نے دیکھا ہے میرے نزدیک وہ اکثر اعتبارات سے ان دونوں تعریفوں کا مستحق ہے ظاہرا اس رسالہ میں عروض کی کوئی ضروری بات فرد گذاشت نہیں ہوئی اور زحافات کا بیان جو اکثر فارسی رسالوں میں بھی پورا پورا بیان نہیں ہوا، اس رسالہ میں بوجہ استیفا لکھا گیا ہے۔ پھر زحافات کا باب جو اکثر کتابوں میں نہایت منتشر طور پر لکھا گیا ہے، اس رسالہ میں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسے ضبط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ طالب علم کو اس کے یاد کرنے میں میرے نزدیک ضرور مدد دے گا۔

مثنوی کی نسبت صرف یہ کہنا کافی ہے کہ نظم میں عروض یا کسی اور فن کا بیان کرنا جس قدر دشوار ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ باوجود اس کے مصنف نے بہت

صفائی اور بے تکلفی سے عروضی مباحث اس میں بیان کئے ہیں اور امید کیجاتی ہے کہ اس صاف وشفاف نظم کے ذریعہ سے طلبہ کو عروض کی ضروری باتیں بآسانی یاد ہوسکیں گی۔

فرہنگِ آصفیہ

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۱۸۸۸ء صفحہ ۵۹۴)

یہ کتاب مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اہلِ وطن کے فائدہ کے لئے تیار کی ہے جس کی نسبت قوی امید ہے کہ چند مہینے میں ختم ہو کر اطراف ہندوستان میں شائع ہو جائے گی۔ اُردو زبان کی ایسی ڈکشنریاں تو کئی لکھی جا چکی تھیں جن میں لغات کی تفسیر انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔ مگر یہ ڈکشنریاں جیسا کہ ظاہر ہے عام ہندوستانیوں کے لئے کچھ مفید نہ تھیں اُن سے صرف وہی معدود ہندوستانی فائدہ اُٹھا سکتے تھے جو انگریزی زبان سے واقف ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تمام ڈکشنریاں جیسی کہ اُردوئے معلیٰ کے تمام الفاظ پر حاوی تھیں اسی طرح اُردو زبان کے فصیح اور غیر فصیح دونوں طرح کے الفاظ بلا امتیاز اُن میں جمع کر دئے گئے تھے۔ ہمارے ہموطنوں کو خوش ہونا چاہئے اور مصنف کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہئے کہ اُس نے اپنے آرام و راحت سے دست بردار ہو کر اور سالہا سال محنت و مشقت اُٹھا کر اُن کے فائدے کے لئے ایک ایسی زبان کا ذخیرہ مہیا کیا ہے جو باوجود اس کے کہ ہندوستان کی عام زبان سمجھی جاتی ہے اور ملک کی عام تصنیف و تالیف، نثر و نظم اور دفاتر و اخبارات وغیرہ کی تحریرات کا مدار بالکل اسی پر ہے، باانیہمہ آج تک تمام ہندوستان میں اس کا شیوع جیسا چاہئے نہیں ہوا۔ اطراف ہندوستان کے وہ لوگ بھی جو فی الواقع ضروری تقریر و تحریر پر قدرت رکھتے ہیں، اگر میری رائے غلط نہیں تو اس ڈکشنری میں آدھے سے زیادہ ایسے الفاظ پائیں گے جن سے وہ پہلے واقف نہ تھے۔

شیخ ابوالفیض فیضی نے جب تفسیر سواطع الالہام لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو لغتِ عرب

پر عبور حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ عربی لغات کی کتابیں خریدا کرتا تھا۔ ایک بار اُس نے کئی ہزار روپئے کی کتابیں اسی غرض سے خریدیں اور جب ان کو اول سے آخر تک دیکھ چکا تو ایک روز مجلس میں کسی نے شیخ سے ان کتابوں کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا الحمدللہ جو حقیر رقم میں نے ان کتابوں کے خریدنے میں صرف کی تھی اُس سے مجھکو بہت فائدہ ہوا۔ میں نے دو لغت ان کتابوں میں ایسے پائے جو پہلے میری نظر سے نہ گذرے تھے۔ چونکہ اس ڈکشنری میں قطعاً اور یقیناً اُردو کے ہزاروں ٹکسالی اور مستند الفاظ ایسے موجود ہیں جو اکثر ہندوستانیوں کے حق میں بالکل نئے اور اجنبی ہوں گے اس لئے جو قدر فیضی نے ان کتابوں کی کی تھی، اُس سے بہت زیادہ ہم کو اس ڈکشنری کی قدر کرنی چاہئے۔

ہندوستان میں جب سے کہ اُردو تحریر کا زیادہ رواج ہوا ہے، وقتاً فوقتاً اُردو ڈکشنری کی ترتیب کے لئے جابجا تدبیریں ہوتی رہی ہیں۔ ایک زمانہ میں سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ نے بھی ایک نمونہ اُردو ڈکشنری کا چھاپ کر شائع کیا جو فی الواقع بہت سلیقہ کے ساتھ لکھا تھا لیکن جس حد تک کہ مصنف نے اس کام کو پہنچایا ہے، آج تک کسی نے نہیں پہنچایا۔

اُردو ڈکشنری لکھنے کے لئے دو نہایت ضروری شرطیں تھیں۔ ایک یہ کہ اُس کا لکھنے والا کسی ایسے شہر کا باشندہ ہو جہاں کی زبان تمام ہندوستان میں مستند سمجھی جاتی ہو اور ایسے تمام ہندوستان میں صرف دو شہر مانے گئے ہیں، دلی اور لکھنؤ۔ مگر میں دلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگرچہ اُردو زبان کا وہ حصہ جس کو زیادہ تر خواص استعمال کرتے ہیں دہلی و لکھنؤ میں چنداں تفاوت نہیں رکھتا، لیکن عوام کی زبان جس سے اہل حرفہ و اہل بازار کے محاورات و اصطلاحات مراد ہیں، اور جو زبان کا بہت بڑا حصہ اور آج ڈکشنری کا جزو اعظم ہے، وہ دہلی میں بہ نسبت لکھنؤ کے زیادہ مستند سمجھے جانے کے لائق ہے۔ شاہانِ اودھ کے مورث اعلیٰ کے ساتھ جو خاندان دہلی سے بگڑ کر لکھنؤ گئے تھے، وہ اکثر دہلی کے امراء و شرفا کے خاندان تھے جن کے اعقاب و اخلاف آصف الدولہ بلکہ سعادت علی خاں کے زمانہ تک

تمام دربار پر حاوی رہے۔ اس لئے اعلیٰ طبقہ میں انھیں کی زبان جاری ہوئی۔ لیکن دہلی کے ادنیٰ طبقوں میں سے اگر کچھ لوگ وہاں گئے بھی ہوں تو اُن کی تعداد اس قدر ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اُن کی زبان لکھنؤ کے تمام عوام الناس کی زبان پر غالب آجائے۔ اس لئے ضرور ہے کہ لکھنؤ کے ادنیٰ طبقوں کی زبان اُس زبان سے مغایر ہو جو دہلی کے انھیں طبقوں میں متداول تھی۔ پس ہمارے نزدیک صرف دلّی ہی کی زبان ایسی ہے جس پر اُردو ڈکشنری کی بنیاد رکھی جائے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو۔ کیونکہ خود دہلی میں بھی فصیح اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشل حالت اُردوئے معلیٰ کو اُن کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی۔ کمال خوشی کی بات ہے کہ ہماری ملکی زبان کی پہلی ڈکشنری جس پر تمام آئندہ ڈکشنریوں کی نیو رکھی جائے گی ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس میں دونوں ضروری شرطیں موجود ہیں۔

جانسن نے ۱۷۴۷ء میں جب انگریزی زبان کی پہلی ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو اُس نے ایک دولتمند امیر کو اپنی ڈکشنری کا پیٹرن بنانا چاہا تھا تاکہ اُس کی مدد سے اپنی کتاب چھپوا سکے، مگر اُس نے پیٹرن بننا منظور نہیں کیا۔ آخر محض اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے عام قبولیت کی امید پر اُس نے اپنا کام شروع کیا اور نہایت استقلال کے ساتھ اُس کو انتہا تک پہنچایا اور تمام قوم سے اپنی محنت کی داد لی۔ گو اس کے بعد ویبسٹر اور اوگلوی جیسی نہایت عمدہ عمدہ ڈکشنریاں لکھی گئیں جن سے جانسن کی ڈکشنری کو اب کچھ نسبت نہیں رہی لیکن جب تک انگلستان اور انگلستان کی زبان زمین کے پردہ پر موجود ہے ہمیشہ جانسن کا نام سب سے اول نہایت ادب اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے گا۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ اُردو ڈکشنری بھی ہندوستان میں وہی وقعت حاصل کرے جو اول جانسن کی ڈکشنری نے انگلستان میں حاصل کی تھی۔ کیونکہ اُردو ڈکشنری کے جامع نے بھی ہمت، استقلال، محنت

اور سلف ہلپ کے لحاظ سے بالکل ویسا ہی کام کیا ہے جیسا جانسن نے کیا تھا۔

اگرچہ ممکن ہے کہ اُردو ڈکشنری میں کچھ باتیں گرفت کے قابل نکلیں لیکن ایسی باتوں اوچھے نکتہ چینوں کی طرح تمام کتاب کو مورد طعن ٹھہرانا یا مصنف کا احسان نہ ماننا سخت بے انصافی ہوگی۔ آدمی بالطبع اپنی بزرگی اور تفوق ثابت کرنے کا شائق ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہے۔ جو لوگ کچھ کام نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے وہ اکثر اوروں کے کام میں عیب نکال کر نہ صرف لوگوں کی نظر میں اپنی فوقیت ظاہر کرتے ہیں بلکہ خود بھی اپنے تئیں اُن سے بہتر سمجھ لیتے ہیں۔ مگر جو لوگ منصف مزاج ہیں اور تحقیق الفاظ کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ امید ہے کہ ہرگز ایسا خیال نہ کریں گے۔ اکثر اوقات صرف ایک لفظ کی تحقیق میں لوگوں سے کئی کئی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں پس ممکن نہیں کہ جو شخص ایک مستقل اور وسیع زبان کے تمام الفاظ کی تحقیقات کرے وہ لغزش اور خطا سے محفوظ رہ سکے۔ ہر کام جب اول ہی اول کیا جاتا ہے تو اس میں بالضرور بہت سی باتیں فروگذاشت ہو جاتی ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً زمانہ اُن کی اصلاح کرتا ہے۔ مگر پیشوائی کا منصب صرف اُسی کام کے لئے ہے جو سب سے اول کیا گیا ہے۔

جوہری نے صحاح بیس برس میں مرتب کی تھی اور اُس کے بعد مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس صرف تین برس میں لکھ لی۔ ایک منصف عالم کے سامنے صاحب قاموس کی کی نہایت تعریف کی گئی کہ اس نے قاموس جیسی کتاب تین برس میں مرتب کر لی۔ اُس عالم نے کہا، تین برس میں نہیں ۲۳ برس میں لکھی ہے، ۲۰ برس جوہری کے بھی اس پر اضافہ کرنے چاہئیں۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہموطن اس ڈکشنری کے بعد اس سے زیادہ جامع اور عمدہ ڈکشنریاں لکھنے کی کوشش کریں گے اور شاید وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوں، مگر اہل انصاف کے نزدیک تمام آئندہ ڈکشنریاں جو اُردو زبان کی تکمیل کے لئے لکھی جائیں گی وہ سب اس ڈکشنری کی طفیلی ہوں گی۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی متعدد ڈکشنریاں جو یورپین مصنفوں نے انگریزی زبان میں ترتیب دی ہیں (جیسی شکسپیئر۔ فوربس اور فالن وغیرہ، جن میں سے فالن ڈکشنری تو خاص اسی مؤلف کی مصالح اور سات برس کی معاونت سے تیار ہوئی) ان سے اُردو ڈکشنری کے جامع کو ضرور کسی نہ کسی قدر مدد ملی ہوگی۔ مگر اس سے اُس کی وہ فضیلت جو کسی کام میں تقدم کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے، زائل نہیں ہو سکتی۔ اول تو جو دقتیں ایک اورنٹیل اسکولر کو انگریزی کتابوں سے مدد لینے میں برداشت کرنی پڑتی ہیں، وہ اُن مشکلات سے شاید کچھ ہی کم ہوں گی جو کسی زبان کی پہلی ڈکشنری کے جامع کو پیش آتی ہیں۔ دوسرے تمام مذکورہ بالا انگریزی ڈکشنریوں کو اس ڈکشنری کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کی بنیاد صرف انگریزی ڈکشنریوں ہی پر نہیں رکھی بلکہ بہت کچھ زیادت و نقصان و تغیر و تبدل اور دخل و تصرف جیسا کہ اہل زبان کو شایاں ہے اپنے علم و رائے کے موافق کیا ہے اور اسی لئے اُس کی ڈکشنری میں بمقابلہ انگریزی ڈکشنریوں کے وہ تفاوت پایا جاتا ہے جو اہل زبان اور زبان والوں کی تحقیقات میں ہونا ضروری اور ناگزیر ہے۔

ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہموطن اس اُردو ڈکشنری کی ایسی ہی قدر کریں گے جیسی کہ حق شناسوں کو اپنے محسن کے احسان کی قدر کرنی چاہئے۔

گلستانِ ناگری

یہ کتاب سمت ۱۹۲۰ مطابق ۱۳۰۵ھ موافق ۱۸۸۸ء میں مطبع رائے بھوانی پرشاد دہلی میں چھپی تھی۔ پنڈت ہرچند داس صاحب اس کے مترجم ہیں۔ کتاب کے دو کالم تھے، ایک میں اصل فارسی اور دوسرے میں اُس کا ہندی ترجمہ۔ اب یہ کتاب نایاب ہے اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ ریویو اس ہندی ترجمہ کے ساتھ ہی شائع ہوا تھا۔

گلستانِ سعدی کے بے شمار ترجمے جو دنیا کی مختلف زبانوں میں اب تک ہوئے ہیں اُن میں سے اخیر ترجمہ ہمارے لائق اور ذی وقعت دوست پنڈت ہرچند داس صاحب جینی رئیس قصبہ سونی پت ضلع دہلی کا ہے، جو کہ انھوں نے نہایت کوشش اور تندہی سے فصیح اور سلیس ہندی بھاشا میں محض اہل وطن کے فائدے کے لئے قلمبند کیا ہے اور جس کو مترجم ممدوح کی اجازت سے رائے بھوانی پرشاد صاحب نے اپنے مطبع میں چھپوا کر شائع کرنا چاہا ہے۔ نہایت تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے میں بھی جو کہ خیالات کی نہایت درجہ ترقی کا زمانہ ہے اور جس نے اکثر قدما کی تصنیفات کو تقویمِ پارینہ کی طرح اہل عالم کی نظر سے گرا دیا ہے، شیخ سعدی کی گلستاں اس زمانے میں بھی اسی قدر مقبول ہے جیسے کہ ساڑھے چھ سو برس تک تمام دنیا میں مقبول رہی۔ یہ کتاب اس وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک مسلمان شخص ہے صرف مسلمانوں ہی میں مقبول نہیں ہے بلکہ ہر مذہب اور ہر ملت کے لوگ اس کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں اور اس کی داد دیتے ہیں۔ یورپ کی شاید ہی کوئی زبان ایسی ہوگی جس میں گلستاں کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ بعض زبانوں میں جیسے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن

ہے آٹھ آٹھ دس دس ترجموں کی نوبت پہنچی ہے۔ ترکی زبان میں خاندان سلطنت کے ایک رکن رکین نے قدیم ترجموں کے علاوہ ایک اور ترجمہ گلستاں کا حال ہی میں مرتب کیا ہے۔ پنڈت ہرچند داس صاحب کی کوشش زیادہ تر اس سبب سے قدر کے لائق ہے کہ انھوں نے زبان حال کے مصنفین اور مؤلفین کی طرح اس ترجمہ سے کوئی فائدہ ملحوظ اور مدنظر نہیں رکھا جس طرح قدیم زمانے کے اہل علم اور ارباب تصنیف ابنائے جنس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے مفید کتابوں کی ترتیب میں اپنی عمریں صرف کرتے تھے، اسی طرح پنڈت صاحب نے اس ترجمہ کے سرانجام کرنے میں محض اس لئے جدوجہد کی ہے کہ جو لوگ فارسی خط اور اُردو زبان کی نسبت ناگری خط اور ہندی بھاشا سے زیادہ مانوس ہیں وہ شیخ کے پاکیزہ اور لطیف خیالات سے پورا پورا لطف اٹھائیں۔ لائق مترجم نے اس ترجمہ میں یہ التزام کیا ہے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں لکھا جائے۔ اور عربی فارسی الفاظ جہاں تک ممکن ہو استعمال میں نہ لائے جائیں اور جہاں تک ہو سکے ترجمہ میں اصل کتاب کے الفاظ کی پابندی کی جائے، اور شیخ کا اسلوب بیان تا بمقدور اپنی حالت پر قائم رہے۔ نظم میں ہر بیت کا مضمون ایک ہی دوہرے میں ختم ہو جائے تاکہ ناظرین کو مصنف کا خیال سمجھنے کے لئے دوسرے دوہرہ کا منتظر رہنا نہ پڑے۔ یہ تمام التزام جس قدر ضروری ہیں اس سے زیادہ دشوار ہیں۔ اور جبکہ مترجم کو بھی خیال ہو کہ زبان کی خوبی ہاتھ سے نہ جائے تو یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ پنڈت صاحب کی یہ کوشش ہموطنوں کے حق میں نہایت مفید ثابت ہو گی اور یہ ترجمہ جس کی بنیاد محض نفع رسانی پر رکھی گئی ہے، ضرور مقبول خاص و عام ہو گا۔

سیرۃ النعمان

(از علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۱۸۹۲ء صفحہ ۵۶)

مولانا کی چند بیش بہا تصنیفیں اس سے پہلے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، جیسے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم"، "مامون رشید کی سوانح عمری"، "رسالہ جزیہ"۔ انھوں نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اُس کے بعد کی تصنیف میں اُن کی لیاقت اور روشن دماغی اُس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے میں سیرۃ النعمان کو اُن سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں۔ اگرچہ اس کتاب پر ریویو لکھنا ایک محدث، فقیہ، مورخ اور ماہر فن رجال کا کام ہے اور میں ان چاروں صفتوں سے معرّا ہوں، لیکن ممکن ہے کہ مثلاً ایک شخص جو ریل کی حقیقت سے واقف نہ ہو مگر اُس میں بیٹھ کر سفر کر چکا ہو، وہ لوگوں کے سامنے جو اب تک ریل میں سوار نہیں ہوئے محض آسائش یا تکلیف کی کیفیت جو اُس پر ریل کے سفر میں گذری ہو بیان کرے۔ ریویو لکھنے میں بشرطیکہ وہ دیانت اور سچائی سے لکھا جائے، اکثر اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ کتاب کا وہ حصہ جو ریویو نگار کی رائے کے موافق ہوتا ہے، اُس کی داد دیجاتی ہے اور جس قدر اُس کی رائے کے خلاف ہوتا ہے وہ مصنف کی لغزش یا خطا پر محمول کیا جاتا ہے۔ اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مثلاً جو کتاب تسنن یا تشیع یا تقلید یا عدم تقلید کی تائید میں لکھی جائے، اُس پر مخالف مذہب کا آدمی کبھی عمدہ ریمارک نہ کر سکے۔ یا جو مضمون ایک اسکول کے فلسفہ پر لکھا جائے ہرگز دوسرے سکول کا پیرو اُس کی داد نہ دے سکے۔

میرے نزدیک ریویو نگاری کا منصب صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ فرائض جن کو زمانہ کا مذاق ہر نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو

کس حد اور کس درجہ تک ادا کئے ہیں پس جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ مصنف کی رائے جزئیاتِ مسائل میں فی نفسہ کیسی ہے، کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے نہ ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ کتاب کا عنوانِ بیان کیسا ہے؟۔ ترتیب کیسی ہے؟۔ طریق استدلال مذاقِ وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی غایت جو مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہیئے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے وہ اُس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟۔ میں اس ریویو میں صرف انھیں باتوں سے بحث کروں گا اور ہرگز ریویو نگاری کی حد سے متجاوز نہ ہوں گا۔ ایک فاضل ادیب محقق (اور اگر وہ منظور کرے تو منشی اور شاعر بھی) جس کی متعدد تصنیفات مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں، اُس کی طرز عبارت اور طرز بیان پر گفتگو کرنی صرف اُن اخبار نویسوں کا کام ہے جن کے پاس اپنے اخبار کے معمولی کالم پورے کرنے کے لئے کوئی مضمون سردست موجود نہ ہو اور وہ ناچار اس مقولہ کے موافق کہ "الغریق یتشبث بکل حشیش" اسی بحث کو غنیمت سمجھیں۔ یہ اس باب میں اس کے سوا کسی بات کے کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ سادگی اور بے ساختہ پن جو عموماً ہر تحریر کی جان اور خاص کر تاریخ و بیوگرفی کا ایمان ہے، وہ اس مصنف کی ہر تصنیف میں ترقی پذیر ہیں۔ جو اسٹائل انھوں نے ابتدا سے اختیار کیا ہے اُس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ رائٹر اور ریڈر دونوں کے لئے رستہ روز بروز زیادہ صاف اور زیادہ ہموار ہوتا جائے۔ ترتیب کا مرحلہ خاص کر کسی مشہور بزرگ کی لائف میں ایسا سخت اور دشوار گذار ہے کہ مصنف بشرطیکہ وہ حق تصنیف سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہو اس مرحلہ میں تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ اگر اُس بزرگ کی لائف کچھ لوگ پہلے لکھ چکے ہیں اور اب ایک نیا مصنف انھیں کے قدم بقدم چلنا چاہتا ہے، اُس کو البتہ کچھ دشوار نہیں ہے۔ لیکن اگر اُس مشہور بزرگ کی لائف ابتک کسی نے نہیں لکھی یا لکھی ہے مگر یہ اخیر مصنف پہلی تصنیفات سے صرف واقعات اخذ کرتا ہے اور ترتیب میں کسی کی پیروی

نہیں کرتا بلکہ اُس کو اپنے مذاق کے موافق بدلنا چاہتا ہے، اُس کو نہایت سخت عقبات سے عبور کرنا پڑتا ہے۔ وہ ابواب وفصول بالکل نئے ڈھنگ سے مقرر کرتا ہے اور بے شمار پراگندہ اور منتشر باتوں کو پہلے اُن ابواب وفصول پر تقسیم کرتا ہے، پھر ہر ایک باب اور ہر ایک فصل میں ان کو ترتیب وار بیان کرتا ہے، ایک ہی بات کبھی اس کو اول لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے اور کبھی آخر اور بیچ میں۔ سیرۃ النعمان کے مصنف کو شاید پہلے حصہ کی ترتیب میں جو امام صاحب کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، ایک آدھ کتاب سے جو تصنیف کے وقت اُن کے پاس موجود تھی کچھ مدد ملی ہو تو ملی ہو، لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کے طرزِ اجتہاد اور اصولِ استنباط سے بحث ہے، اُس کی ترتیب میں یقیناً اُن کو اپنے مذاق اور سلیقہ سے کام لینا پڑا ہے۔ اور جہاں تک ہم دیکھتے ہیں دونوں حصوں میں حسنِ ترتیب کا حق پورا پورا ادا ہوا ہے۔ فلسفہ میں حسن کی تعریفیں مختلف طور پر کی گئی ہیں، لیکن سب سے زیادہ جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ حسن تناسبِ اعضا کا نام ہے۔ پس جس طرح کسی حسین آدمی کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کے اعضا متناسب ہیں، اس کے کمالِ حسن وجمال کا اقرار کر لینا ہے اسی طرح کسی کتاب کی نسبت صرف یہ کہنا کہ اس کی ترتیب ٹھیک ہے گویا یہ مان لینا ہے کہ اُس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کتاب میں جو استدلال نقل و روایت سے کیا گیا ہے گو وہ مخالف پر حجت نہ ہو سکے لیکن موافقین کی تسلی کے لئے کافی و وافی ہے۔ اور ایک ایسے سوال پر جس میں ہزار برس سے اختلافات چلے آتے ہیں ایسا استدلال جس کا مدار محض نقل و درایت پر ہو اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ رہا وہ استدلال جس میں قابلِ ادب مصنف نے اپنی رائے اور قیاس سے کام لیا ہے، اُس کی نسبت کم سے کم یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ ایسے طریقہ استدلال سے ہمارے لٹریچر میں فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ مصنف نے نہایت عمدگی سے بتایا ہے کہ کیونکر امام صاحب اور اُن کے اتباع کو اہل الرائے کہا گیا؟ کس لئے انھوں نے مذہب میں قیاس کو کثرت سے دخل دیا؟ ۔ روایت حدیث

کے لئے کیوں ایسی شرطیں لگائیں جن سے حدیث کا دائرہ تنگ ہو جائے؟ روایت کے اصول جو انھوں نے فن حدیث میں قائم کئے اُن سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا؟ فقہ کی حالت امام صاحب سے پہلے کیا تھی؟ اور انھوں نے اُس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ فقہ کی تدوین اور اُس کو ایک جامع قانون کی حد تک پہنچانے کا خیال اُن کو کیونکر پیدا ہوا فقہ کی تدوین انھوں نے کس احتیاط کے ساتھ کی اور کیسے کیسے جلیل القدر لوگوں کو اس میں شریک کیا۔ فقہ حنفی کو اس قدر حسن قبول کیوں حاصل ہوا؟ کس لئے وہ تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئی اور باوجودیکہ امام صاحب میں مثل دیگر ائمہ مجتہدین کے ذاتی خصوصیتیں نہ تھیں، کیوں اُن کی فقہ نے اس قدر رواج پایا؟۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تشریعی اور غیر تشریعی حدیثوں میں فرق اور امتیاز قائم کیا، ورنہ اُن سے پہلے شارع کے تمام اقوال وافعال خواہ تبلیغ رسالت کے متعلق ہوں اور خواہ دنیوی مصالح سے سب تشریعی سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے بہت عمدگی سے یورپ کے بعض مورخوں کے اُس شبہ کو کہ فقہ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے دفع کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی کتابوں سے بہت کم واقفیت حاصل کی ہے اور فقہ حنفی کی تدوین تک کوئی ترجمہ یونانی وغیرہ سے نہیں ہوا، چہ جائیکہ کسی قانونی کتاب کا ترجمہ جو آج تک ثابت نہیں ہے۔ انھوں نے کمال لیاقت سے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کی وجہ سے فقہ حنفی کو تمام فقہوں پر ترجیح حاصل ہے۔ مثلاً یہ کہ امام صاحب بخلاف اشاعرہ کے حسن و قبح اشیاء کو عقلی مانتے ہیں نہ شرعی۔ یا یہ کہ فقہ حنفی بہ نسبت تمام فقہوں کے زیادہ آسان ہے۔ اور شریعت کا اصل مقصد جس کی بابت تصریح کی ہے کہ "

جیسا فقہ حنفی سے حاصل ہوتا ہے اور کسی فقہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس بات کو مصنف نے ایسی خوبی و بسط کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جس قدر کتابیں امام صاحب کے حالات میں پہلے لکھی جا چکی ہیں، اس بات نے سیرۃ النعمان

کو اُن سے بہت بلند درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ اس باب میں ایک ایسا بڑا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کافی ثبوت
دینا آسان کام نہیں ہے۔ باایں ہمہ جہاں تک کہ ایک سرسری نظر سے رائے قائم ہو سکتی ہے، اُس کے
لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے جتنی خصوصیتیں فقہ حنفی کی جتائی ہیں اُن کے ثبوت
میں قابل اطمینان مثالیں پیش کی ہیں اور ان مثالوں کے بہم پہنچانے میں نہ صرف سعی و کوشش کا
حق ادا کیا ہے بلکہ اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھائے ہیں۔ باایں ہمہ جس طرح دریائے
نیل کا اصل منبع ایک ہی سفر میں دریافت نہیں ہوا اسی طرح ممکن ہے کہ اس باب کی تکمیل کے لئے
مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے۔ خاتمہ میں مصنف نے
منجملہ اُن چالیس بزرگوں کے جو امام صاحب کے ساتھ تدوینِ فقہ میں شریک تھے دس ممتاز شخصوں
کا اور اُنکے علاوہ بعض اور ائمہ وقت کا جو حدیث و رجال میں امام کے شاگرد تھے تذکرہ لکھا ہے۔ یہ
خاتمہ بھی نہایت دلچسپ اور ایک ایسے ضروری مضمون پر مشتمل ہے جس کے بغیر امام صاحب کی سوانحعمری
ناتمام رہتی۔ اس کتاب کا خیال جسقدر کہ لفظ سیرۃ النعمان سے دل میں پیدا ہوتا ہے بہ نسبت اس کے
میرے ریویو سے شاید کچھ ہی زیادہ پیدا ہوگا۔ پس جو لوگ اس کتاب کی اصل حقیقت اور مصنف
کی لیاقت کا پورا پورا اندازہ کرنا چاہتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ اُس کو خود اول سے آخر تک دیکھیں۔
اس کتاب سے صرف امام اعظم کی عظمت اور اُن کی فقہ کی جلالتِ شان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ بھی معلوم
ہوتا ہے کہ اسلام کی خالص آب وہوا انسان کے دل و دماغ پر کیا اثر رکھتی تھی اور جبتک یہ چشمہ اپنے منبع
سے قریب رہا، اُس سے علم و اخلاق کی کھیتیاں کیسی سرسبز و شاداب ہوتی تھیں۔ امام صاحب کے
حالات، اُن کے اخلاق، اُنکا طریقۂ معاش، اُنکی طرز معاشرت اور اُن کی مساعیٔ جمیلہ جو اُن سے
اسلام کی خدمت میں بن آئیں بلاشبہ ایسی ہیں کہ مسلمان بلکہ خود اسلام اُن پر جس قدر فخر کرے بجا ہے
اور ایسی ہیں کہ اُن کو ہمیشہ نصب العین رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہونا چاہئے، کیونکہ وہ صرف دین
ہی میں نہیں بلکہ دنیوی امور میں بھی بہت بڑی رہنما ہوں گی۔ ان فی ذالک لعبرۃ
لاولی الالباب۔

انوارُالاخلاق

(منقول از انوار الاخلاق پانچواں اڈیشن ۱۹۰۶ء صفحہ ۱-۲)

مولوی نذر احمد صاحب نورؔ کی مصنفہ اُردو مضامین کی ایک کتاب ہے جو عرصہ تک پنجاب کے مڈل اور ہائی اسکولوں میں بہت مقبول رہی۔

جتنے مضامین اس کتاب میں درج ہیں، میں نے اول سے آخر تک کچھ خود دیکھے اور اکثر پڑھوا کر سُنے۔ مصنف کی طرز بیان سے جو ملک کی خیرخواہی اور طالبعلموں کی ہمدردی کا جوش ظاہر ہوتا ہے وہ ہر وطن دوست کو ان مضمونوں کے اول سے آخر تک دیکھنے اور پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

مصنف کی اصل غرض ان مضامین کے لکھنے اور ترتیب دینے سے جیسا کہ اُن کے عنوانِ بیان سے ظاہر ہے، یہ معلوم ہوتی ہے کہ مڈل اور انٹرنس کے طالب علم جن کو جواب مضمون میں امتحان دینا پڑتا ہے اُن کے لئے ایک ایسا ذخیرہ معلومات کا مہیا ہو جائے جو ان کو اس سبجکٹ میں مدد دے، لیکن ضمناً ان مضامین سے وہ بکار آمد ہدایتیں اور نصیحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں جن کی اس زمانہ میں نہایت ضرورت ہے۔

اس کتاب میں ۲۵ مضمون ہیں جن کے عنوان حسب تفصیل ذیل ہیں۔

وقت۔ کفایت شعاری اور فضول خرچی۔ ورزش۔ تعلیم نسواں۔ بچپن کی شادی بچوں کو زیور پہنانا۔ شرافت انسانی۔ اخلاق (یعنی حسن معاشرت) خوشامد۔ اتفاق۔ ہمدردی صحبت یا ہمنشینی۔ ادب محنت۔ ہمت اور استقلال۔ سفر۔ علم۔ مطالعہ۔ اخبار۔ چھاپہ لکھنا۔ پڑھنا۔ حساب۔ صنعت و حرفت۔ زراعت۔ تجارت۔ دیسی اور ولایتی کپڑا۔ ٹیکا اور چیچک۔ روشنی۔ ریل گاڑی۔ تاریخ و جغرافیہ۔ ایک آدھ علمی مضمونوں کے سوا

یہ تمام مضامین اُن نصائح و اخلاق پر مشتمل ہیں جن کی فی زمانا ہندوستانیوں کو عموماً اور طالب علموں کو خصوصاً نہایت ضرورت ہے۔ مصنف نے ہر ایک مضمون کے متعلق وہ باتیں لکھی ہیں جو سکول کلاسوں کی استعداد اور سمجھ کے لائق اور اُن کی حالت کے مناسب ہیں اور مطالب کے ادا کرنے میں ایسا سٹائل اختیار کیا ہے جس کی پیروی اور تتبع کرنے سے سکول کلاسوں کے طالب علم مایوس نہ ہوں۔ مضمون نگاری میں جبکہ اس سے کسی خاص درجہ کے طلبہ کو انشا پردازی سکھانی مقصود ہو، سب سے اہم اور ضروری بات یہی ہے کہ طرز بیان ایسی اختیار کیجائے جس کو اس درجہ کے طالب علم بآسانی اختیار کر سکیں۔

رسالہ "ادیب"

(منقول از رسالہ ادیب جلد ۱ نمبر ۱ بابت جنوری ۱۸۹۹ء)

فیروز آباد ضلع آگرہ سے یہ ماہوار رسالہ جنوری ۱۸۹۹ء میں جاری ہوا تھا۔ سید اکبر علی اس کے مہتمم اور ایڈیٹر تھے۔

ادیب کا پہلا نمبر پہنچا۔ ایک ہی جلسہ میں اُس کو اول سے آخر تک پڑھ گیا اور بہت محظوظ ہوا۔ ظاہرا یہ رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔

انشائے نوراحمد

(منقول از انشائے نور احمد صفحہ ۱)

انشائے نور احمد مولوی نور احمد صاحب سابق ممبر ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے مڈل اور پرائمر کے طلبہ کو خطوط نویسی سکھانے کے لئے مرتب کی تھی۔ مندرجہ ذیل ریویو انشائے مذکور پر ۲۰ نومبر ۱۸۹۹ء کو مولانا نے پانی پت سے لکھ کر مصنف کو بھیجا تھا۔

اس انشا کو میں نے لیٹے لیٹے دیکھا۔ افسوس کہ میں اُس پر مفصل ریویو کرنے کے قابل نہیں ہوں، مگر اس قدر بلا تصنع لکھتا ہوں کہ اُردو میں آج تک میں نے کوئی انشا اس سے بہتر نہیں دیکھی۔ آپ کی کتاب انوار الاخلاق بلا شبہ عمدہ کتاب ہے لیکن اس انشا سے ہر شخص جو خط و کتابت سیکھنی چاہتا ہے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ علاوہ خط و کتابت کے عرضی نویسی، وثیقہ نگاری اور ہر قسم کی تحریریں جو کچہریوں اور دفتروں میں لکھی جاتی ہیں، سب کے لئے یہ کتاب ایک عمدہ رہبر ہے، امید ہے کہ اس کی قبولیت روز بروز بڑھتی جائے گی اور مبتدیوں کو اس سے بے انتہا فائدہ پہنچے گا۔

دیوانِ انور

(از رسالہ معارف بابت اپریل ۱۹۱۰ء)

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی

حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

وہ زمانہ جبکہ دلّی نے اپنے آخری وقت میں تھوڑی دیر کے لئے سنبھالا لیا تھا، اگرچہ اس وقت پرانے کمالات کی سوتیں آئندہ کے لئے بالکل بند ہو گئی تھیں مگر اگلے زمانے کے بچے کھچے اہل کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہو گئے تھے، لیکن مرغان خوش الحان خزاں کی آمد آمد سے بے خبر بدستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے۔ دلّی کا یہ اخیر جھمکڑا جس کے تصور سے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے، ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اس کے پس ماندہ قافلہ کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے دنیا سے رخصت کیا ہے۔

اب محو بوئے گل یہ ہوا کب دل حزیں — ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

اسی قافلے میں ایک جوان صاحب کمال سید شجاع الدین حسین انور عرف امراؤ مرزا خلف الصدق صلاح الدولہ مرصع رقم خاں سید جلال الدین حیدر رضوی استاد بہادر شاہ بادشاہ تھے جو ۱۸۵۷ء میں جبکہ سیاہ باغی کے ہنگامہ نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی بعمر سیزدہ سالگی اپنے والد بزرگوار اور برادر بزرگ سید ظہیر الدین حسین ظہیر کے ہمراہ پانی پت میں آ کر کئی برس تک یہاں مقیم رہے یہ پہلا موقع تھا کہ اس یوسف خانماں آوارہ اور خاک میں ملے ہوئے موتی نے راقم کو اپنا خریدار بنایا۔ بیگانگی ایک ہی نگاہ میں آشنائی کے ساتھ بدل گئی اور آشنائی نے جلد جلد محبت و یکجہتی کی سرحد میں قدم رکھنا شروع

کیا۔ مگر زمانہ آناً فاناً رنگ بدل رہا تھا اور انقلاب پر انقلاب ہو رہا تھا، وہ صحبت بہت جلد برہم ہوگئی اور بھولے ہوئے خواب کی طرح اُس صحبت کا ایک دھندلا سا خیال باقی رہ گیا لیکن کچھ بہت زمانہ گذرا تھا کہ شاہ جہاں آباد ہمیشہ کے لئے فقیر کا رمنا بن گیا۔ اتفاق یہ ہو کہ محبت نے جس قیدخانہ میں لیجا کر مقید کیا سید انور بھی اُسی قیدخانہ کے اسیر نکلے۔ مخدومی محمد کرم اللہ خاں شیدا کا دیوانخانہ جو دوستی اور صداقت کا مرکز اور آزادوں کا ملجا و ماویٰ اور زندہ دلی کا جمگھٹ ہے، سالہا سال وہاں شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہیں اور ان صحبتوں میں سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک اکثر شریک ہوتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے دست بردار ہو کر ہر شخص زبان حال سے اس شعر کا مضمون ادا کرتا تھا۔

بزم مے اچھی ہو گو دنیا ہو اے میخوار ہیچ ‏ ‏ یہاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ

لیکن آخر کار نہ معلوم شعر کی نحوست سے یا اس سبب سے کہ زمانہ تفرقہ کی بنیاد ہمیشہ کے لئے سوسائٹی میں ڈال چکا تھا، اکثر اصحاب دلی چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر و پراگندہ ہوگئے۔ اگرچہ ایک مدت کے بعد راقم لاہور سے اور سید انور جے پور سے دلی میں پھر آگئے مگر چونکہ دفتر قضا سے فراق دائمی کا فرمان جاری ہو چکا تھا، ابھی گذشتہ مفارقت کا زخم بھرنے نہ پایا تھا کہ اُس مرحوم نے عالم آخرت کی راہ لی اور جو زخم بھرتا آتا تھا وہ ہمیشہ کے لئے ناسور بن گیا سید انور مرحوم میں کمال شاعری کے علاوہ متعدد کمالات جمع تھے۔ خط نسخ میں وہ بلا مبالغہ اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اس فن میں جو کمال اُن کے جدِ بزرگوار نے قاضی عصمت اللہ دہلوی سے حاصل کیا تھا، سید انور پر گویا اُس کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ باوجود اس کے نستعلیق میں بھی وہ شہر کے عام خوشنویسوں میں کسی سے کم نہ تھے اور یہ جامعیت اُن کی خاندانی خصوصیات میں سے تھی۔ وہ صرف شاعر اور خوشنویس ہی نہ تھے بلکہ علوم متعارفہ میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے

اس کلیہ کو کہ الکاتب جاھل غلط ثابت کر دیا تھا۔ خصائل و عادات کے لحاظ سے میں ان کو مستثنیٰ لوگوں میں شمار کرتا تھا۔ سادگی و پرہیز گاری، آزادہ روی و خودداری، ہر حال میں خوش رہنا اور اُس اشراف گردی کے زمانہ میں پاسِ وضع کو ہاتھ سے نہ دینا، اُن کی خاص خصلتیں تھیں۔ انھوں نے اُس وقت جبکہ خدا کے سوا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا اپنے دست و بازو پر بھروسا کیا اور جس جان نے بے فکری اور فارغ البالی کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا، اُس کو فوراً محنت و مشقت میں ڈال دیا اور جوانمردوں کی طرح اہل و عیال کے لئے دوڑ دھوپ اور تگ و دو میں بسر کی۔ بزرگوں کے کمالات جو اگلے زمانے میں نام و نمود اور عزت اور شرف کے ذریعے خیال کئے جاتے تھے، جب وقت پڑا تو اُن کو بے تکلف ذریعۂ معاش گردانا۔ اور جواہر گراں بہا کو جبکہ بازار میں کوئی جوہری نظر نہ آیا کنبے کے نان و نفقہ پر قربان کر دیا۔ اللہ اللہ اُس مرحوم جامع اوصافِ کمال کی تصویر آج پندرہ برس بعد پھر آنکھوں کے سامنے آئی ہے۔

ہمارے عزیز دوست لالہ سری رام ایم۔ اے۔ خلف الرشید آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال ایم۔ اے۔ بیرسٹرایٹ لا رئیس دہلی نے سید انور مرحوم کا دیوان چھپوا کر ازراہِ محبت ہمارے پاس بھیجا ہے، گویا مدت کے بچھڑے ہوئے دوست کو دوست سے ملا یا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اپنے عزیز دوست لالہ سری رام کی اس مہربانی اور یادآوری کا شکریہ ادا کریں یا اُن کی اس کوشش اور توجہ کی داد دیں جو انھوں نے اپنے وطن کے ایک صاحب کمال کی یادگار قائم کرنے اور اُن کے نام زندہ کرنے میں فرمائی، یا اُس احسان کا ذکر کریں جو عزیز موصوف نے اس دیوان کی اشاعت سے سید انور کے دوستوں اور عزیزوں پر کیا ہے، یا اُس کیفیت کو بیان کریں جو اس دیوان کو دیکھ کر ہمارے دل پر گذری ہے۔ اس دیوان نے وہ قدیم کوچہ ہم کو پھر یاد دلایا ہے جس کی تیس برس خاک چھاننے کے بعد زمانہ کی زبردستی سے اُس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکے تھے۔ اس میں بہت سی غزلیں ان مشاعروں کی ہیں جن پر دلّی کی شاعری کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ اور جن میں بار ہا سید انور، سید

ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ شریک ہو کر ہم نے اُن کی ہم طرحی کی عزت حاصل کی تھی۔ کبھی کبھی نواب مرزا خاں داغ بھی رامپور سے آکر ان مشاعروں میں مشاقوں کی سامعہ نوازی کرتے تھے اور شہر کے اکثر شریف زادے اور امیرزادے جن میں سے بہت سے چل بسے اور خال خال باقی ہیں۔ ہر طرح کی زمینوں میں زور طبیعت دکھاتے تھے۔ مرزا غالب مرحوم و مغفور کا اخیر زمانہ تھا۔ غالباً وہ خود کبھی ان جلسوں میں نہیں آئے مگر اُن کی دیکھی ہوئی اور اصلاح دی ہوئی غزلیں برابر آتی تھیں اور پڑھی جاتی تھیں۔ گو اب خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے اور پچھلی حالت کے تصور سے شرم آنے لگی ہے مگر گذرا ہوا زمانہ خواہ بچپن کی نادانی کا زمانہ ہو یا جوانی کی بدمستی کا، اُس کی یاد میں عجیب لذت رکھی گئی ہے کہ کوئی چیز اُس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ پچھلا زمانہ جیسا کہ کہا گیا ہے بعینہٖ نمائشِ سراب کا حکم رکھتا ہے کہ جب پاس تھے تو ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ تھا مگر دور سے وہی ٹیلے دریائے موّاج کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں۔ وہی مشاعرے جو اب بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں اگر اُن کا پھر ہاتھ آنا ممکن ہو تو کون ایسا بے دید اور طوطا چشم ہو گا جو نئی روشنی کو اُس قدیم تاریکی سے بدلنے پر فی الفور آمادہ نہ ہو جائے۔ سچ ہے ؎

لگے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد — لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ دیوان جس کا نام معزز اشاعت کنندہ نے "نظم دلفروز" رکھا ہے اور ہم اُس کو اس لحاظ سے کہ وہ صاحب دیوان کی جدائی کا داغ تازہ کرنے والا ہے "نظم دلگداز" کہتے ہیں، شاید نئے بگڑے ہوئے شاعر اُس کی جیسی کہ چاہیئے قدر نہ کریں اور ایک نئے مسلمان کی طرح جس کا قصائی کی دوکان کے سوا کہیں جی نہیں لگتا، اس دیوان

کے ساتھ شاید کچھ دلچسپی ظاہر نہ کریں مگر جو لوگ پرانے مذاق کے متوالے ہیں اور اب تک انھیں پر ملک کی شاعری کا دار و مدار ہے اُن کے لئے یہ دیوان ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ جو ہمارے معزز دوست کی بدولت ملک میں عام طور پر شائع ہوا ہے اور مطبع رفاہ عام لاہور سے بہت ارزاں قیمت پر بحساب ۱۲ ار فی جلد مل سکتا ہے۔

معلم الشطرنج

(از معلم الشطرنج مطبوعہ سنہ ۱۹۰۱ء)

اس کتاب کو بقدر ضرورت میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ اگرچہ میرا یہ منصب نہیں ہو کہ ایک ایسی کتاب کی نسبت جس کا موضوع فن شطرنج بازی ہو اُس کے مضمون کی حیثیت سے کچھ چون وچرا کر سکوں، کیونکہ یہ درحقیقت ایک ماہر و مشاق شاطر کا کام ہے جو اس فن میں یدطولیٰ رکھتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے اس لئے ہر شخص جو اُردو زبان کو سمجھ سکتا ہو وہ کم سے کم اس بات کا حق رکھتا ہے کہ مصنف کی طرزِ تصنیف وطرز بیان یا کتاب کے مفید وغیر مفید ہونے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔

جہاں تک مجھکو معلوم ہے آج تک کوئی کتاب ہماری زبان میں شطرنج پر ایسی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی اور اس فن کے متعلق اس قدر معلومات کا ذخیرہ ہندوستانیوں کے واسطے کبھی جمع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ہموطن اس کتاب کے مفید ہونے میں تامل کریں، مسلمان تو اس وجہ سے کہ اُن کے مذہب میں لہو ولعب میں مشغول ہونا ممنوع ہے اور ہندو اس وجہ سے کہ جن لوگوں کو اس کھیل کا لپکا پڑ جاتا ہے وہ اکثر اپنے ضروری اور بڑے بڑے فرائض کو شطرنج بازی پر قربان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کو کھانے پینے بلکہ اپنے آپے کی بھی خبر نہیں رہتی لیکن لعب کا اطلاق اُن کھیلوں پر ہوتا ہے جو کسی عمدہ مقصد کے لئے نہیں بلکہ صرف تضیع اوقات کے طور پر کھیلے جاتے ہیں پس شطرنج اگر خاص اوقات میں اس غرض سے کھیلی جائے کہ تامل اندیشی اور تدبر کی عادت پڑے اور دماغ میں سوچنے اور غور کرنے کا ملکہ پیدا ہو تو ہرگز لعب میں شمار نہیں ہوسکتی۔

اس کے سوا کوئی کام صرف اس وجہ سے مذموم نہیں ٹھہر سکتا کہ بعض اشخاص اُس کو بُری طرح کرتے ہیں۔

کتاب کا مطالعہ جو بالاتفاق ایک نہایت مفید اور عمدہ مشغلہ ہے وہ صرف اس وجہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ بعضے لوگ اُسی کے ہو رہتے ہیں اور تمام دینی اور دنیوی کاموں کو مطالعہ کے شوق پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق لالہ جیون لال صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو چاندنی چوک بازار دہلی نے اپنے اشتہار میں لکھا ہے اُس میں سرمو مبالغہ نہیں کیا گیا، بلکہ جس طرح اکثر عمدہ کتابوں کے اشتہارات میں بسبب اختصار کے اُن کتابوں کی اصلی خوبیاں پوری پوری بیان نہیں ہو سکتیں اسی طرح صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو کا اشتہار کتاب معلم الشطرنج کی بہت سی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے یعنی جبکہ اس میں بہت سے یورپین شاطروں کے کمالِ شطرنج بازی کا ذکر جا بجا کیا گیا ہے تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ ہندوستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔ خصوصاً انیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خاں و میرزا رحیم الدین حیا و امام علی خاں وغیرہ ہم ضرور اس بات کے مستحق تھے کہ جو کتاب ہندوستان کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کئے ہوئے کھیل پر لکھی جائے، اُس میں اُن کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جائے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہندوستانی شاطروں کی کسی بازی یا کسی نقشے کا سُراغ لگانا ممکن ہو۔ جو شاطر مر گیا اُس کی بازیاں اور اُس کے نقشے بھی اُسی کے ساتھ مر گئے۔ البتہ ہمارے عزیز دوست راجا بابو صاحب نے اُردو لٹریچر میں ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ اگر اُس کی پیروی کی گئی تو ہمارے آئندہ شاطروں کے عمدہ عمدہ نقشے آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رہ سکیں گے۔

دلی میں عبدالحکیم نامی ایک مشہور غائب باز تھا جس کو ہم نے خود حاضر و غائب دونوں

طرح کھیلتے دیکھا ہی۔ اُس کی نسبت یہ بات مشہور تھی کہ وہ حاضر بازی میں تو بات بھی ہو جاتا ہی مگر غائب بازی میں کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اُس کی ایک بازی کا نقشہ بھی کسی کو یاد نہیں۔ اسی لئے جیساکہ راجا بابو صاحب نے اکثر کتاب میں تصریح کی ہے اس ملک میں فن شطرنج بازی روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے۔ شاید بعض نکتہ چیں اس جدید تصنیف پہ ریمارک کریں کہ اگر فن شطرنج بازی کو غیر مفید تسلیم کرلیا جائے تو بھی اس موضوع پر کتاب لکھنا اُس وقت زیبا تھا جبکہ ہمارا لٹریچر اور ہماری زبان تمام ضروری علوم وفنوں سے مالا مال ہو جاتی اور مصنفین کے لئے کوئی میدان اس کے سوا باقی نہ رہتا کہ کھیلوں اور بازیوں کے قواعد منضبط کرکے ان کو کتابوں کے لباس میں جلوہ گر کریں۔ اسی قسم کا اعتراض اُس کتاب پر کیا گیا تھا جو حال ہی میں فرانس اور پروشیا کی جنگ کے بیان میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ اعتراض ترجموں کی نسبت ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ مترجم مختلف مضامین میں سے جس مضمون کو سب سے مقدم اور ضروری سمجھے ترجمہ کے لئے انتخاب کرسکتا ہی، مگر ایک اریجنل تصنیف کے لئے کسی مضمون کا اس طرح انتخاب کرنا ممکن نہیں کیونکہ ایسی تصنیف اُسی مضمون پر سرانجام ہو سکتی ہی جس میں مصنف نے کم وبیش کمال حاصل کیا ہو اور اُس کی ممارست میں ایک معتدبہ حصہ عمر کا صرف کیا ہو۔ پس درحقیقت ایک اریجنل مصنف کا یہ کام نہیں ہی کہ جو مضمون ملک کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور مفید ہو اس پر خواہی نخواہی طبع آزمائی کرے بلکہ براہ راست اُس کا کام یہی کہ جس فن میں اُس نے کمال حاصل کیا ہی اُس میں جو کچھ تجربہ اور معلومات اُس نے بہم پہنچائی ہوں اُن کو قدیم مصنفوں کی معلومات میں شامل کرکے اُس سے ملک کو مستفید کرے۔

ہم کو امید ہی کہ راجا بابو صاحب کی کتاب معلم الشطرنج اُن تصانیف کے لئے جو آئندہ اس فن پر خاصکر اردو زبان میں لکھی جائیں گی بمنزلہ اساس اور بنیاد کے ہوگی اور جتنی عمارتیں اُس بنیاد پر چنی جائیں گی اُن کے باقی ہونے کا فخر ہمارے لائق مصنف کو ہوگا۔

رسالہ "معارف"

منقول از رسالہ معارف جلد۴ نمبر۱ بابتہ اکتوبر ۱۹۱۰ء

رسالہ معارف یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو مولوی وحید الدین سلیم کی زیر ادارت علیگڑھ سے نکلنا شروع ہوا۔ اس میں اعلیٰ درجہ کے تاریخی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے جو نہایت محنت اور جانکاہی سے مرتب کئے جاتے تھے۔ اپنے وقت میں یہ علمی مضامین کا ہندوستان بھر میں واحد میگزین تھا۔ ملک کے لائق ادیبوں نے اس کو بہترین رسالہ تسلیم کیا تھا۔ تین جلدیں علیگڈھ میں نکالنے کے بعد خرابیٔ صحت کے باعث مولوی وحید الدین اس کو اپنے وطن پانی پت میں لے آئے اور جنوری ۱۹۱۰ء سے چوتھی جلد کا آغاز کیا۔ مگر افسوس کہ مالی مجبوریوں کے باعث (جو ہر عمدہ رسالہ کے اڈیٹر کو ضرور پیش آتی ہیں) دسمبر ۱۹۱۰ء میں یہ اعلیٰ درجہ کا علمی اور ادبی رسالہ بند ہو گیا۔

معارف بیشک موجودہ حالت میں عمدہ ترین رسالہ ہے جو ہندوستان میں اس وقت نکلتا ہے۔ میں "معارف" کی دل سے قدر کرتا ہوں اور ملک کے موجودہ میگزینوں میں اُس کو خاص امتیاز کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

قوانینِ دولت

(منقول از "قوانین دولت" صفحہ ۵۰)

پولٹیکل اکانومی پر یہ ۸۰ صفحہ کی کتاب اکتوبر ۱۹۰۳ء میں استاد محترم جناب مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے اُس وقت شائع کی تھی جبکہ وہ صوبہ گلبرگہ (دکن) کے انسپکٹر مدارس تھے۔ یہ کتاب ہارسس بل کی انگریزی تصنیف "لاز آف ویلتھ" کا ترجمہ ہے جس میں سیاست مدن کے ابتدائی اصول نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ بعض ضروری مضامین کی زیادتی عنوانات کی تقسیم نے کتاب کو اور بھی مفید بنا دیا۔ اب نایاب ہے۔ مندرجہ ذیل ریویو اس پر مولانا حالی نے اُسی زمانے میں لکھا تھا۔

میں نے رسالہ "قوانین دولت" کو اول سے آخر تک بہ نظر غور دیکھا۔ اگرچہ پولٹیکل اکانومی میں اب سے پہلے متعدد کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں مگر اب تک شاید کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا جو مدارس کی درمیانی جماعتوں کی استعداد اور سمجھ کے لائق ہو اور نیز عام اردو داں بھی اُس کے مضامین سے مستفید ہو سکیں۔

اُردو میں یہ رسالہ دو وجہ سے امتیاز رکھتا ہے۔ اول تو مترجم نے ترجمہ کے لئے ایسی کتاب انتخاب کی ہے جس میں مصنف نے اس فن کی ابتدائی مگر نہایت اہم اور ضروری باتوں کے بیان پر اکتفا کیا ہے اور ایسے دقیق مسائل سے کچھ تعرض نہیں کیا جو عام ذہنوں سے بالاتر ہوں۔ دوسرے خود مترجم نے جو انگریزی کے سوا عربی، فارسی اور اُردو میں بھی عمدہ لیاقت رکھتے ہیں، اس بات میں نہایت کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ بامحاورہ اور فصیح اُردو میں ہو اور بیان میں کسی قسم کی گنجلک یا اُلجھاؤ باقی نہ رہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس رسالہ کی اشاعت سے مصنف اور مترجم دونوں کا مقصد بخوبی حاصل ہوگا اور یہ کتاب متوسط درجہ کی استعداد والوں کے لئے جو اس فن سے واقفیت پیدا کرنا چاہیں، بمنزلہ رہنما کے ثابت ہوگی۔

فلسفۂ تعلیم

(منقول از فلسفۂ تعلیم مطبوعہ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۰۰)

میں نے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ سپنسر مرحوم کی بے مثل کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ جو "انجمن ترقی اردو" کی فرمائش سے مولوی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے کیا ہے۔ مختلف مقامات سے خود بھی دیکھا اور مترجم موصوف نے بھی اُس کا بہت بڑا حصہ مجھے پڑھ کر سنایا۔ اور جس احتیاط اور صبر کے ساتھ اُنھوں نے اس ترجمہ کو پورا کیا ہے اُس سے بھی میں بخوبی واقف ہوں۔

اگرچہ اس ترجمہ کی نسبت، جو انگریزی سے اُردو زبان میں کیا گیا ہے ایک ایسا شخص جو انگریزی زبان سے بالکل نابلد ہو رائے دینے کا استحقاق نہیں رکھتا، لیکن وہ اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمے کے ذریعے سے مصنف کے عمیق و دقیق خیالات کو کہاں تک اُردو داں پبلک کے فہم کے لائق کر دیا ہے اور جس زبان میں اصل کتاب کے مضامین ادا کئے گئے ہیں وہ کہاں تک سائنس کے بیان کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں باتوں کے لحاظ سے مترجم کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اُنھوں نے ترجمے کی تکمیل اور زبان کی صفائی اور شستگی میں اپنے اصلی فرائض سے بہت زیادہ اور انجمن کی امیدوں سے بمراتب بڑھ کر عرق ریزی و جانفشانی کی ہے۔

درحقیقت یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ انجمن کو اس کتاب کے ترجمے کے لئے ایک ایسا شخص مل گیا جو قطع نظر انگریزی، عربی اور فارسی کی جامعیت کے فطرۃً علمی مشاغل پر فریفتہ اور اپنے فرائض کو عاشقانہ دلچسپی اور شغف کے ساتھ انجام دینے والا ہے۔ فقط

رسالہ "اتحاد"

(منقول از رسالہ اتحاد جلد ۱ نمبر ۳ بابت یکم مئی سنہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۱)

مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم نے "اتحاد" کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ لکھنؤ سے جاری کیا تھا جس کا واحد مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم شیروشکر کرنا اور اُن میں اتحاد و اتفاق کی بنیاد ڈالنا تھا۔ رسالہ کا پہلا پرچہ یکم اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شائع ہوا تھا نیچے کا ریویو اسی کے متعلق ہے۔

جس مقصد کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے اس کو میں ایسا ضروری اور اہم جانتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے حق میں اس سے زیادہ مہتم بالشان کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔

رسالہ "آفتاب"

(منقول از رسالہ آفتاب جلد ۲ نمبر ۱ بابت فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۲)

"آفتاب" نامی ایک ماہوار رسالہ جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) سے سید محمد حسین صاحب رضوی کی زیرادارت فروری ۱۹۰۶ء سے جاری ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل خط ریویو کے طور پر مولانا نے اڈیٹر کو لکھا تھا۔ مولانا اُس وقت حیدرآباد میں تھے اور آپ نے وہیں سے یہ ریویو لکھ کر بھیجا تھا۔

مکرمی

رسالہ آفتاب کے دو نمبر پہنچے۔ اُن کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اُس کو پڑھ کر بے انتہا مسرت حاصل ہوئی کیونکہ ہمارے رئیسوں کا اس طرف متوجہ ہونا اور ایسی لیاقت سے علمی مضامین لکھنا ہندوستان کے بھلے دن آنے کی امید ہے۔ بابو امبالال صاحب کا مضمون "تعلیم" پر اور آپ کا مضمون "تعصب" پر بھی بہت عمدہ مضمون ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ آفتاب ملک میں چمکے گا۔ دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کامیاب ہوں اور آفتاب کی روشنی تمام راجپوتانہ میں پھیلے۔

سوانح عمری حضرت محمدؐ

(منقول از سوانح عمری مذکور۔ ایڈیشن دوم مطبوعہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۲۵)

یہ کتاب شری دیپرکاش دیو جی نے جو براہمو دھرم کے پرچارک ہیں اول مرتبہ اپریل ۱۹۰۰ء میں شائع کی تھی۔ ۱۳۶ صفحات کی چھوٹی تقطیع ہے۔ تمام واقعات نہایت اختصار، بہت بے تعصبی اور بیحد دلنشیں اور دلچسپ پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ اعتراضات کے نہایت خوش اسلوبی۔ عمدگی اور متانت کے ساتھ معقول جوابات دئے ہیں۔ وہ لوگ جو جا و بیجا حضور صلعم پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اس کتاب کو ضرور مطالعہ کریں۔

اس کتاب کی نسبت جو کچھ میں نے اخباروں میں دیکھا اور لوگوں سے زبانی سنا تھا، اُس سے بہت زیادہ اس کو تعریف کے لائق پایا۔ معزز مصنف نے یہ کتاب لکھ کر سچائی اور حق پسندی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی ہم سب ہندوستانیوں کو تقلید کرنی چاہئے۔ اب تک ہمارے تمام ہموطن خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اس خیال خام میں مبتلا رہے ہیں کہ غیر مذہب کی خوبیوں پر جہاں تک ممکن ہو پردہ ڈالیں اور چن چن کر اُس کی بُرائیاں ظاہر کریں۔ جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے تمام اہل مذاہب اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ غیر مذہب کے کسی اعتراض کو تسلیم کر لینا یا اُس کی کسی خوبی کا اقرار کرنا اپنے مذہب سے نکل جانے کے برابر ہے۔ براہمو دھرم کا یہ اصول کہ وہ ہر ایک مذہب کے پیشواؤں کی تعظیم کرتا ہے۔ بالکل اصول اسلام کے مطابق ہے۔ اور یہی وہ اصول ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ مذہبی جھگڑے شاید رفتہ رفتہ دنیا سے مفقود ہو جائیں۔

اگرچہ مجھے یقین ہے کہ شری دھے پرکاش دیو جی نے یہ کتاب مسلمانوں کے خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض صداقت کے ظاہر کرنے کے لئے لکھی ہے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کا خوش ہونا اُس کا لازمی نتیجہ ہے، اس لئے وہ تمام مسلمانوں کی طرف سے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

تصانیف نواب عزیز جنگ بہادر

(از علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۴ اگست ۱۹۰۹ء)

جن لوگوں نے زمانۂ حال میں اپنے گراں بہا تصنیفات سے اُردو زبان کو سرمایہ دار بنایا ہے اور اپنی لٹریری قابلیت سے جس قدر خود فائدہ اٹھایا ہے اُس سے بہت زیادہ پبلک کو فائدہ پہنچایا ہے اُن میں نواب عزیز جنگ بہادر کا درجہ کسی سے کم نہیں ہے۔

وہ عرصہ دراز تک سرکار عالی نظام (خلد اللہ ملکہ) میں عمدہ خدمات پر سرفراز رہے ہیں اور اب یہ جلدوی حسن خدمت مختلف صیغوں سے معقول وظیفہ پاتے ہیں۔ زمانۂ ملازمت میں اُن کی تصنیف و تالیف کا میدان زیادہ تر فن قانون میں محدود رہا۔ چنانچہ اس عرصہ میں تیرہ کتابیں آپ نے بحسب ضرورت مختلف اوقات میں ترتیب دیں جن کے صلے میں پانچہزار روپیہ سرکار عالی سے مرحمت ہوا۔ یہ کتابیں صدر اور مفصلات کے تمام دفاتر میں عام قبولیت کا درجہ رکھتی ہیں اور تمام مالی اور حسابی دفتروں میں آج تک اُنھیں سے کام چلتا ہے۔

ان قانونی تالیفات کے بعد آپ نے ایک لاجواب کتاب موسوم بہ سیاق دکن سنہ ۱۳۱۲ فصلی میں شائع کی جس میں عالی قدر مصنف نے فن سیاق کی حقیقت مورخانہ طور سے بیان کی ہے اگرچہ اس کتاب کا نام سیاق دکن ہے لیکن درحقیقت خلافت کے زمانے سے آج تک تمام اسلامی سلطنتوں کے دفاتر میں جو طریقہ حساب کتاب کا جاری رہا ہے یہ کتاب اُس پر کلیۃً حاوی ہے۔ ہم اس کتاب کی تعریف میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے ریویو کا صرف ایک فقرہ لکھنا کافی سمجھتے ہیں جو انھوں نے کتاب مذکور کی نسبت تحریر فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:-

ہم نے تاریخ کے سیکڑوں ہزاروں ورق اُلٹے ہیں اور مدت تک جستجو کی ہے کہ قدیم زمانے کے ہر قسم کے طریقۂ کارروائی سے واقف ہوں اور گو ہم نے چند معمولی باتوں کو آب و رنگ دے کر ناظرین کو محظوظ کر لیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ جو کچھ ڈھونڈ کر پا سکے وہ من میں چھٹانک بھی نہ تھا۔ نواب عزیز جنگ بہادر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ" انھوں نے صرف حسابی سیاق کے متعلق ۱۶۶ صفحہ کی کتاب تیار کر دی جو عجیب و غریب تحقیقات سے لبریز ہے"

اب کتاب کے دیکھنے سے سلاطین تیموریہ کے زمانے کا طریقہ سیاق اس طرح آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ گویا ہر قسم کے دفاتر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ نادر الوجود کتاب سرکار نظام کے سررشتۂ تعلیم کے کورس میں داخل ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس کی قدر ہوئی ہے۔

مصنف ممدوح جہاں تک دیکھا جاتا ہے معمولی اور پامال مضامین پر ہاتھ نہیں ڈالتے بلکہ ہمیشہ اچھوتے مضامین پر جن کی ضرورت محسوس کرتے ہیں قلم اٹھاتے ہیں۔

انھوں نے کاشت خرما، کاشت انگور، کاشت انجیر اور کاشت ترکاری پر بہت بسط کے ساتھ مفید کتابیں لکھی ہیں جن میں سے اول کی دونوں پر سرکار عالی سے معقول انعام عطا ہوا ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے اگریکلچر آفس نے اُن پر نہایت تعریف کے ساتھ ریویو لکھا ہے۔ ایک اور کتاب فن فلاحت ہی کے متعلق موسوم علاج النباتات زیر تصنیف ہے جس میں نباتات کی بیماریوں اور ان کے معالجات کا بیان ہے اور جو عنقریب چھپنے والی ہے۔

سنہ ۱۳۲۲ ہجری میں مصنف ممدوح نے ایک اور مبسوط کتاب تقریباً پونے چھ سو صفحے کی فن تاریخ میں شائع کی تھی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی ہے اور

جس کا نام تاریخ النوائط ہے۔

تاریخ دکن میں مدت سے یہ سوال حل طلب چلا آتا تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جو مدت دراز سے سواحل بحر ہند یا جنوب مغربی ہند میں نائط یا نائطی کے نام سے نامزد ہے اور جس میں بڑے بڑے اہل اللہ، والیان ملک، وزراء، امراء، علماء، شعراء اور تجار ہوتے رہے ہیں اس کی اصل کیا ہے۔ آیا یہ کوئی قوم حدیث الاسلام ہے یا کسی عہد میں سرزمین عرب سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ قوم نایط کا اجمالی ذکر لغت اور تاریخ کی اکثر کتابوں میں کیا گیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس عقدہ کے حل کرنے میں بہت سی ایسی مشکلات تھیں اور مصنفین کے بیانات میں اس قدر اختلافات تھے کہ اجمالی ذکر سے اس مرحلے کا طے ہونا امکان سے خارج تھا۔

مصنف ممدوح نے کم و بیش چھ سو صفحے کی کتاب اس ایک تاریخی سوال کے حل پر لکھی ہے اور حق بات کا سراغ لگانے میں ایسی چھان بین کی ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی۔ ہمارے نزدیک اگر جلیل القدر مصنف خود قوم نایط کے ایک مقتدر رکن نہ ہوتے تو ان تمام الجھنوں کا سلجھانا جو اس سوال کے حل کرنے میں پیش آنے والی تھیں ایک ایسا کام تھا جس سے شاید وہ عہدہ برآ نہ ہوسکتے جیسا کہ کہا گیا ہے اهل البيت ادرى بما فيه۔

سب سے بڑی مشکل اس سوال کے حل کرنے میں یہ تھی کہ قوم نوایط کے مخصوصات رسم و رواج اور القاب وغیرہ میں بہت سی باتیں ایسی موجود تھیں اور ہیں جو ہندوؤں کے بعض اقوام سے ملتی جلتی ہیں اور جن سے قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اقوام ہنود میں سے کوئی قوم ہے۔ مگر معزز مصنف نے متعدد تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ قوم نوایط عرب کے اُن مہاجرین کی یادگار ہیں جنھوں نے زیادہ تر بنی امیہ کے عہد میں اور کسی قدر بنی عباس کے زمانے میں حکومت کی سختیوں سے تنگ آکر عرب سے ہجرت

اختیار کی اور آخر کار آٹھویں صدی⁽¹⁾ ہجری میں دریا کی راہ سے سواحل بحر ہند میں پہنچکر بھٹکلہ، کوکن، گودہ وغیرہ میں سکونت اختیار کی اور محمد ہاشم خاں نظام الملکی کی کتاب منتخب اللباب سے کافی ثبوت اس بات کا دیا ہو کہ اس قوم کے لوگ جب اول ہی اول ہندوستان میں پہنچے تو ایک عرصہ دراز تک ان کو ہندوؤں کی حکومت میں رہنا اوران تمام شرائط کو منظور کرنا پڑا جو فرمانروایان وقت کی طرف سے پیش ہوئیں اور جن کی منظوری بغیر وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ ان شرائط کے موافق ان کو مذہبی عقائد کے سوا تمام امور میں ہندوانی طرز معاشرت اختیار کرنی ضرور تھی۔ چنانچہ جب تک وہاں کی حکومت میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ تمام ہندوانی رسم رواج کے پابند رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بھی اُس قدیم طرز معاشرت کے آثار بہت کچھ قوم نایط کے اکثر گھرانوں میں پائے جاتے ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں قوم نایط کے تمام مخصوصات یعنی مذہب، لباس زبان، طریقہ تعلیم وتربیت، کفو کی پابندی، پردہ کا رواج اور دیگر رسوم اور قومی انقلاب جن سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے متمیز ہوتا ہے، ایسی تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ تمام قوم کی طرز معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً تعلیم نسواں کے بیان میں علاوہ سینے پرونے اور دیگر دستکاریوں کے اٹھائیس طرح کی مٹھائیاں اور پکوان بتائے ہیں، جو قوم نایط کی لڑکیوں بلکہ لڑکوں کو بھی سکھائے جاتے ہیں۔ یا مثلاً ساٹھ زیوروں کے نام اور اُن کی تعریف بیان کی ہے جو اس قوم کی مستورات استعمال کرتی ہیں۔ خصوصاً قوم نایط کے مختلف قبائل کے تقریباً ستر القاب اور اُن کی وجہ تسمیہ نہایت کاوش اور تحقیق کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل باب میں

(۱) غالباً اس میں غلطی ہو اس لئے کہ عباسی خاندان کا خاتمہ ۶۵۶ھ میں ہوگیا تھا۔

قوم موصوف کے مشاہیر کا حال جن میں سر سالار جنگ اول، حیدر علی نایک اور ٹیپو سلطان جیسے ممتاز امرا اور بڑے بڑے علما اور شعرا اور اہل اللہ اور نامور تجار شامل ہیں، بشرح اور بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ کتاب مصنف کی اُس خاص صفت پر جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے بدرجہ اوفیٰ دلالت کرتی ہے۔ یعنی ہر ایک کام کو پوری طاقت کے ساتھ انجام دینا اور تصنیف کے فرائض ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔ اس کتاب کو قطع نظر ممالک دکن کے جہاں قوم نایط کثرت سے پائی جاتی ہے اور اطراف ملک میں بھی قبولیت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس کو بہت پسند کیا ہے اور اس کی معتد بہ جلدیں خریدی ہیں۔

فن تاریخ میں مصنف ممدوح نے ایک اور کتاب موسوم بہ محبوب السیر حضور آصف جاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کی نسبت سالہ حکومت پر لکھی ہے۔ یہ کتاب بھی ہندوستان میں بنظر استحسان دیکھی گئی ہے۔

حال میں انھوں نے ایک اور نفیس کتاب جس کا نام عطیات سلطانی ہے چھپوا کر شائع کی ہے۔ یہ کتاب بھی مصنف کی اکثر تصنیفات کی طرح بالکل ایک نرالی تصنیف ہے۔ کتاب کا نام سننے سے فوراً یہ خیال ذہن میں متبادر ہوتا ہے کہ شاید حضور شاہ دکن نے کسی خاص موقع پر کچھ عطیات لوگوں کو مرحمت فرمائے ہیں ان کی تفصیل اس کتاب میں درج کی گئی ہوگی۔ مگر جب کتاب کو کھول کر دیکھا جاتا ہے تو ایک عجب ذخیرہ معلومات کا نظر آتا ہے جس کی نسبت جناب مولوی ابو المظفر محمد سعید الدین صاحب رامپوری نے اپنے ریویو میں بالکل درست اور بجا لکھا ہے کہ

"فن تاریخ میں یہ پہلی کتاب ہے جو ہماری نظر سے گذری ہے۔ ہم بیشک واقف تھے کہ بادشاہانِ سلف نے اہل ملک کو قیمتی معافیں

اُن کی گذر اوقات کے لئے عطا فرمائی ہیں اور اُن کے صدقۂ جاریہ سے
صفحہ روزگار پر اُن کی اعلیٰ یادگار قائم ہے اور بعض صاحبان تاریخ نے
کہیں کہیں اس کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن ہم یہ نہ جانتے تھے کہ اس
کی کیفیت اس قدر مبسوط اور دلچسپ ہے کہ اس سے فن تاریخ کا ایک
مکمل ذخیرہ ہاتھ آسکتا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مصنف ممدوح اُن معمولی مضامین پر بہت کم قلم اٹھا
ہیں جن پر اُن کے پہلے لوگ طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی قبیل کی ایک تصنیف
ہے۔ ممالک دکن میں معاشداروں کا ایک جم غفیر ہے جس کو شاہان سلف سے وقتاً
فوقتاً کثیر المقدار اور کثیر التعداد انعامات وجاگیرات وغیرہ بطور مدد معاش کے عطا
ہوتی رہی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے انھیں انعامات وجاگیرات کو ایک
خاص ترتیب اور نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کی اصلی حقیقت اور
مصنف کی عرق ریزی اور تحقیقات کا حال تو بغیر اس کے کہ اس کو اول سے آخر تک
بغور مطالعہ کیا جائے معلوم نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں ایک بات ایسی ہے جس کے
بالاجمال بیان کر دینے سے کتاب کی عظمت بخوبی منکشف ہو سکتی ہے۔ اس کتاب
کے ورق ورق اور صفحہ صفحہ سے ریاست حیدر آباد کی عام فیاضی، بے تعصبی اور
انسانی ہمدردی کا ایسا ثبوت ملتا ہے جو شاید دنیا کی کسی حکومت یا سلطنت میں
نہیں مل سکتا۔ ہندو مسلمانوں کے معابد اور اُن کی مذہبی رسوم میں جو امداد اس
ریاست سے ہوتی ہے اُس کے متعلق معزز مصنف کا بیان ہے کہ

"ان اقسام عطیات سے جو خاص کر اس باب میں بیان ہوئی ہیں، ہم
نے مسلمانوں کی معاش کی تعداد اور مقدار بہ نسبت معاشہائے ہنود
کے بہت کم پائی ہیں۔ ختم خوانی، اعتکاف اور چلہ کشی کی معاشیں

(جو خاص مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں) صرف خال خال ہیں۔ برخلاف اس کے اگنی ہوتر، نند ادیب اور اساڑھی کی معاشیں (جو ہنود سے متعلق ہیں) کثرت سے جاری ہیں۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

"ہمارا حتمی دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی کل دیسی ریاستوں میں سے ایک ریاست بھی سلطنت آصفیہ کے ساتھ اس خاص صفت بے تعصبی میں ہم قدم نہ ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رحم دل رئیس پر جس طرح اس کی مسلمان رعایا فدا ہے اسی طرح اس کی ہندو رعایا جاں نثار ہے۔ یہ صفت اس خاندان میں سلف سے چلی آتی ہے اور یہ پرداخت صرف لفظوں ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی مادی شہادت سررشتہ عطیات کی سیر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا مالک جس طرح اسلامی تقاریب میں نذریں پیش کشیں قبول کر کے مسلمانوں کو عزت بخشتا ہے اسی طرح اپنی ہندو رعایا کی مذہبی تقاریب میں اُن کی نذریں اور تحفے قبول فرماتا ہے۔ اگر کسی نو وارد سجادہ نشین درگاہ کی بھانی میں کوتاہی نہیں ہوتی تو ساتھ ہی کسی سیاح دھاتا اور دھابیر کی خدمت اور امداد سے بھی کنارہ کشی نہیں کی جاتی۔ حیدر آباد کے چار صوبوں میں ایک کا گورنر مسلمان تو دوسرے کا گورنر ہندو ہے اور باقی دو کے گورنر بھی غیر مسلمان ہیں۔ معتمد مال کرسچین ہے تو معتمد عدالت مسلمان اور معتمد پولیٹکل پارسی تعلقداران اضلاع میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش ہیں ہائی کورٹ کے ججوں میں ہندو اور مسلمانوں کا جوڑا لگا ہوا ہے۔ نظمائے صوبہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ججان و مددگاران عدالت اور مجسٹریٹوں

میں بھی یہی نسبت ہے۔ دو معین المہام مسلمان ہیں تو ایک کرسچین اور ان پر وزیر اعظم ہندو۔ یہی وجہ ہے کہ جو اتحاد و یک جہتی ریاست ممدوح کے ہندو مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ کسی ہندوستانی ریاست میں دیکھی پائی نہیں گئی۔ اسلامی پیشواؤں کی نذر و نیاز کی تقریبیں اور عشرہ محرم الحرام میں عزاداری کے مراسم ہنود کے گھروں میں اسی طرح جاری ہیں جیسے مسلمانوں کے گھروں میں۔

علی ہذا القیاس جاتراؤں میں مسلمانان ریاست برابر ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں جوبلی چہل سالہ کے موقع پر ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ خوشی اور شادمانی کے اظہار میں ہر ایک مذہب و ملت کی جماعتیں ایک دوسرے پر سبقت کرنی چاہتی تھیں اور اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہر ایک قوم کے مردوں کی طرف سے پیشگاہ حضور نظام میں بے شمار سپاس نامے اور اڈریس پیش ہوئے تھے اسی طرح عیسائی اور پارسی عورتوں نے بھی اس خوشی میں حصہ لیا تھا۔

اگرچہ یہ کتاب ایک مختص المقام مضمون (یعنی ریاست حیدر آباد کے اقسام عطیات) پر مشتمل ہے لیکن درحقیقت وہ عام ہندوستانیوں کے لئے ہے جو مورخانہ مذاق رکھتے ہیں ویسی ہی دلچسپ اور پرلطف ہے جیسی اہل دکن کے لیے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ سررشتہ تحقیقات عطیات جو حضور آصفجاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کے عہد میمنت میں قائم ہوا ہے، اگر معزز مصنف کو ایک معتد بہ مدت تک اُس سے خاص تعلق نہ رکھا ہوتا اور اُن کی ہمہ گیر طبیعت میں اپنی ہر قسم کی معلومات سے فائدہ اٹھانے اور عمدہ نتائج پیدا کرنے کا مادہ نہ ہوتا تو وہ اس مضمون پر ایسی دلچسپ اور پرلطف کتاب لکھنے میں مشکل سے کامیاب ہو سکتے تھے۔

نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیفات کا سلسلہ مذکورہ بالا کتابوں ہی پر ختم نہیں

ہوتا بلکہ اس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے انھوں نے ابھی ایک اور نادر کتاب موسوم بہ غرائب الجمل ۱۰۸ صفحہ پر چھاپ کر شائع کی ہے جو فنِ جمل میں (جس کی رو سے واقعات کی یادداشت کے لئے تاریخی مادے استخراج کئے جاتے ہیں) جہاں تک کہ راقم کو معلوم ہے ایک بےمثل ولاجواب تالیف ہے۔

اس کے سوا کئی سال سے آپ نے ایک فارسی ڈکشنری بھی لکھنی شروع کر رکھی ہے۔ جس میں علاوہ فارسی الفاظ و محاورات کے ہر فارسی لفظ یا محاورہ کی تحقیق کے بعد جو محاورہ اُس کی جگہ اُردو میں مستعمل ہوتا ہے اُسے بھی ساتھ کے ساتھ بیان کیا ہے اور دونوں زبانوں کا کوئی لفظ یا محاورہ (الا ماشاء اللہ) ایسا نہیں لکھا جس پر اہل زبان کے کلام سے ایک سند یا متعدد سندیں پیش نہ کی گئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ معزز مصنف نے یہ ایک ایسا کام شروع کیا ہے جس کا پورا ہونا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں انھوں نے اس کتاب کا اندازہ فرما کر راقم سے کہا تھا کہ اگر وہ ختم ہو گئی تو ۲۸ جلدوں میں آئے گی اور ہر ایک جلد سات آٹھ سو صفحے سے کم نہ ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ کتاب میری زندگی میں ختم ہوتی نظر نہیں آتی لیکن خدائے تعالیٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام صفات جمع کر دیے ہیں جو بڑے بڑے مصنفین میں سُنی اور دیکھی گئی ہیں۔ ہمت، جفاکشی، ضبطِ اوقات، حسنِ انتظام، فضول کاموں سے نفرت، سلیقہ، ستھرائی اور اسی قسم کے دیگر اوصاف جو اُن میں دیکھے گئے ہیں وہ بہت ہی کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہم کو خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ اُن کی عمر میں اُن کے اوقات میں اور اُن کے مساعیِ جمیلہ میں برکت دے گا اور اُن کو اپنے اس ارادے میں کامیاب فرمائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خطوط امیر احمد مینائی

(منقول از خطوط امیر احمد مینائی صفحہ ۱ - ۳)

منشی امیر احمد مینائی لکھنؤ کے رہنے والے مولوی کرم محمد صاحب مینائی کے فرزند ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں انتقال کیا۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب تھے۔ یہ کتاب منشی صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے شاگردوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو لکھے۔ یہ خطوط منشی صاحب کے شاگرد رشید مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب نے عرصہ دراز کی تلاش کے بعد جمع کر کے نومبر ۱۹۱۰ء میں شائع کئے۔

کتاب مندرجہ عنوان کا مسودہ جو میرے لائق دوست خواجہ محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر رسالہ مرحوم "قند پارسی" نے مرتب کیا ہے، میری نظر سے گذرا۔ خواجہ صاحب موصوف جناب منشی امیر احمد صاحب مغفور سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں۔ ان کا شاگردانہ خلوص اس بات کا مقتضی تھا کہ اپنے واجب التعظیم استاد کا حق شاگردی کسی مناسب پیرائے میں ادا کریں۔ اول انھوں نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا مگر بعض اسباب سے جن کا ذکر انھوں نے دیباچہ میں کیا ہے، مٹیریل بہت کم میسر آیا۔ پھر ان کے مکتوبات جمع کرنے کی طرف توجہ کی، لیکن باوجود اس کے کہ ایک عالم سے جناب ممدوح کی خط و کتابت تھی خطوط بھی بقدر توقع بہم نہ پہنچے۔ بایں ہمہ ایک معتدبہ مقدار مکاتیب کی جمع ہوگئی۔

اگرچہ ایک ایسے نامور بزرگ کے حالات لکھنے کے لئے یہ مختصر ذخیرہ کافی نہ تھا،

لیکن اس خیال سے کہ شاید آئندہ کوئی صاحب اس عمارت کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں اور یہ تالیف اس عمارت کے لئے ایک بنیاد کا کام دے سکے، خواجہ صاحب موصوف نے میٹیریل کی کمی سے ہمت نہیں ہاری اور اپنی خوش سلیقگی سے اس مختصر ذخیرہ کو ترتیب دیکر ایک دلکش پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

انھوں نے اس کتاب میں اول جناب ممدوح کی مختصر لائف قلمبند کی ہے، پھر اُن کے کلام پر نہایت آزادی کے ساتھ ریویو کیا ہے اور اُن کے دونوں دیوانوں کا مقابلہ فصیح الملک مرحوم کے دیوانوں سے کرکے دونوں اُستادوں کے کلام میں جو فرق دیکھا وہ بغیر کسی قسم کے حیف دمیل کے پبلک پر ظاہر کیا ہے۔ اور پست و بلند دونوں قسم کے اشعار کے نمونے دونوں صاحبوں کے کلام سے التقاط کرکے ناظرین کو دکھائے ہیں

اگرچہ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے اہل قلم میں ابھی تک نکتہ چینی کا تحمل اور اُس کی برداشت پیدا نہیں ہوئی، لیکن اگر ان کو رفتہ رفتہ اس کا عادی نہ کیا جائے تو امید نہیں کہ ہماری تصنیف و تالیف کے عیوب و صواب کبھی پبلک پر ظاہر ہوسکیں۔

اس کے بعد انھوں نے اس مقصد کی طرف توجہ کی ہے جس پر کتاب کا نام مندرجہ عنوان دلالت کرتا ہی یعنی جناب منشی صاحب مرحوم کے خطوط جس قدر بہم پہنچے ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف جیسا اس کی بے تکلفانہ خط و کتابت سے ہوسکتا ہے ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتا، اسی واسطے مکتوب کو نصف ملاقات قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہوگیا، اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا، اب اس کی ملاقات محض اُس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور بس۔ پس کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلمبند کردینا ہی

مجھے امید ہے کہ مکتوبات امیر کی اشاعت خاص کران لوگوں کے لئے جو حضرت امیر احمد مینائی سے عقیدت رکھتے ہیں اور جن کی تعداد ہندوستان میں کچھ کم نہیں ہے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

تسخیر شوہر

(منقول از علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۱۱ نمبر ۲ بابتہ ۲۴ رمئی ۱۹۱۱ء صفحہ ۲)

یہ ایک چھوٹی تقطیع کی ۴۴ صفحہ کی کتاب منشی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کی اہلیہ نے تالیف کی تھی، بلاشبہ مفید ہے۔

دراصل اس کتاب کا محرک رسالہ عصمت دہلی کا ایک انعامی اعلان تھا جو ستمبر ۱۹۱۰ء کے رسالہ میں مسز زاہدی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ (اسماعیل)

یہ ٹھیک اسی قبیل کی تالیف ہے جس کی اس زمانے میں کواری اور بیاہی شریف زادیوں اور شریف زادوں کی تربیت اور اصلاح کے لئے نہایت ضرورت ہے۔ کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ بیبیوں کو خاوندوں کے ساتھ اور خاوندوں کو بیبیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ برتنا چاہیئے کہ طرفین میں روز بروز محبت، ہمدردی اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا خیال زیادہ ہوتا جائے کبھی اَن بَن نہ ہونے پائے۔ گھر کے انتظام میں خلل واقع نہ ہو، اولاد کی تعلیم و تربیت پر میاں بی بی میں کشمکش نہ ہو۔ کتاب کی زبان اور بیان کی خوبی پر یہی دلیل کافی ہے کہ اس کی عبارت کی اصلاح اس شخص نے کی ہے جس نے اردو کی ایک جامع ڈکشنری لکھ کر دلّی کی خاص زبان اور خاص محاورات کو سب سے پہلے تمام اہل ملک سے روشناس کیا ہے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں تبدیلی لڑکیوں اور لڑکوں کے حق میں یہ مختصر رسالہ نہایت مفید ہوگا۔

حیات النذیر

مؤلفہ سید افتخار عالم مارہروی مرحوم

(منقول از حیات النذیر صفحہ ۹ تا ۱۲)

میں مصنف حیات النذیر کی اس خاص عنایت کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھکو مولانا کی سوانح عمری کے مطالعہ کا حد سے زیادہ مشتاق دیکھ کر اپنی کتاب پہلے اس سے کہ چھپ کر بہمہ جہت تیار ہو جائے، خاکسار کو عنایت کی ہے۔ ظاہرا مصنف نے حیات النذیر کی ترتیب مولانا کی زندگی ہی میں شروع کردی تھی۔ ورنہ اُن کی وفات کے بعد جس کو بہت زمانہ نہیں گذرا ایسی مفصل و مشرح لائف کا سرانجام کرنا نہایت دشوار تھا۔ بہرحال مصنف نے اس کتاب کے لکھنے سے ایک ایسا فرض ادا کیا ہے کہ جب تک وہ ادا نہ کیا جاتا، میرے نزدیک قوم کا کوئی اہل قلم اس بار سے سبکدوش نہ ہوسکتا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی عام تصنیفات سے جو احسان اُردو لٹریچر پر کیا ہے اور اپنے جادو اثر لکچروں سے جو سکہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ خصوصاً قرآن مجید کی خدمت کے لحاظ سے جو امتیاز انھوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہے اُس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اُس وقت کرسکیں گے جب اُن کی وفات پر ایک معتد بہ زمانہ گذر جائیگا اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حسب و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کا ترجمہ جو انھوں نے کیا ہے اُس کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اُس کی اشاعت کو سولہ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ اس قلیل عرصہ میں اُس کے گیارہ اڈیشن مختلف صورتوں میں چھپ کر شائع

ہو چکے ہیں اور کل اڈیشنوں کی کچھ اوپر اڑتالیس ہزار جلدیں اب تک فروخت ہو چکی ہیں اور اُس کی مانگ یوماً فیوماً زیادہ ہوتی جاتی ہے اس سے بھی زیادہ اُس کی قبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کو اس وقت سوا سو برس کا عرصہ گذر چکا ہے اور جب مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت شروع ہوئی اُس وقت شاہ صاحب کے ترجمے کو ایک سو نو برس گذر چکے تھے، اس عرصہ میں اہل سنت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ مگر جب ترجمہ نذیریہ کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی اور ملک کے ہر طرف سے اُس کی مانگ آنی شروع ہوئی دفعتاً بہت سے اصحاب قرآن مجید کی خدمت یعنی مولوی نذیر احمد کی تقلید پر کمربستہ ہو گئے اور چند سال کی مدت میں متعدد وجدید ترجمے چھپ کر تیار ہو گئے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ ان جدید ترجموں نے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچایا؟ شاہ صاحب کے ترجمے سے بہ سبب اس کے کہ اُن کے زمانے میں اُردو زبان اور اُس کی بول چال اور مترجمی قرآن کی ابتدائی حالت تھی، قرآن مجید کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا مگر ترجمۂ نذیریہ کی بامحاورہ اردو اور طرز ادائے مطلب کی مدد سے قرآن کا مطلب پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب بخوبی سمجھنے لگے اور کلام الٰہی سے ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق لذت اور فائدہ اٹھانے لگا۔ لیکن ان ترجموں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا کہ کہیں کہیں ترجمۂ نذیریہ کے الفاظ بدل دئے جن کے بدلنے کی کوئی وجہ اس کے سوا معلوم نہیں ہوتی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ایک مستقل مترجم قرآن کہلانے کا ممتاز درجہ حاصل کر سکیں یا اس بہانے سے رجسٹری شدہ ترجمۂ نذیریہ کے چھاپنے کے مجاز ہو جائیں۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے نہ اُن کو پبلک میں ممتاز درجہ حاصل ہوا اور نہ اُن کے ترجموں کو وہ حسن قبول نصیب ہوا جس سے اُن کو کوئی مالی فائدہ پہنچ سکتا۔ بہرحال مولانا نذیر احمد مرحوم نے قرآن مجید کی جو خدمت کی ہے اُس کی مفصل کیفیت بیان کرنے کا یہ موقع

نہیں ہی اگر زندگی نے وفا کی اور خدا کو منظور ہوا تو کسی دوسرے موقع پر اس باب میں اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے جائیں گے۔ مختصر یہ ہی کہ شاہ صاحب کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لئے قرآن کریم کی جو خدمت اس بزرگ سے بن آئی ہمارے نزدیک آج تک کسی سے بن نہیں آئی۔ ہمارے علمائے دین سے نہایت تعجب ہی کہ اکثر صاحبوں نے ترجمہ مذکور پر اعتراض کرنے میں تو کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا (ممکن ہے کہ بعض صحیح ہوں۔) اور اکثر مدعیان ترجمہ نے اُس سے پیٹ بھر کر فائدہ اٹھایا مگر بدقسمتی سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اُس مرحوم کی کوشش کی داد دینا تو درکنار ایک حرف بھی اُس کے حق میں کسی کے منہ سے نکلتا۔ اِنَّ ھٰذا لشیءٌ عجاب۔

اب میں مصنف حیات النذیر کی شان میں چند الفاظ لکھتا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کتاب نہایت لیاقت اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہی۔ باوجودیکہ راقم کی حالت مدت سے مطالعہ کی اجازت نہیں دیتی پھر بھی کتاب کی دلچسپی اور ہیرو کی عظمت نے مجبور کر دیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس معزز لائف کو خود پڑھوں یا اوروں سے پڑھوا کر سنوں۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ اقتباسات ہیں جو مولانا کی کتابوں یا اُن کے خطوں سے مصنف نے جابجا انتخاب کئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی عام تحریروں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اُن کا کوئی بیان شروع ہونے کے بعد جب تک کہ ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پس جبکہ عام تحریروں کا یہ حال ہے تو جو اقتباسات مصنف نے خاص توجہ کے ساتھ مولانا کی کتابوں سے انتخاب کئے ہیں ظاہر ہے کہ وہ کس قدر دلاویز اور دلکش ہوں گے۔ اس سے زیادہ ہم مولانا کی طرز تحریر کے متعلق اس ریویو میں بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہر مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اس شخص کو اپنے شمائل میں تھی وہ اُس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سر سید مرحوم



کو اپنے سیدھے سادے سٹائل میں حاصل تھی۔ اسی طرح مولانا کے لیکچروں پر یہاں اس سے زیادہ کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے جو بقول مصنف مسٹر ہاریسن بالقابہ نے مولانا کے لیکچروں کے متعلق کہا تھا کہ "صدہا برس تک یورپ ایسا سپیکر نہیں پیدا کر سکتا۔

اس موقع پر مولانا کی تحریر و تقریر کا ذکر محض برسبیل تذکرہ آگیا ہے کیونکہ ہمارا اصل مقصد حیات النذیر کی ترتیب اور مصنف کے اس اہتمام بالشان کام پر رائے زنی کرنا ہے ورنہ مولانا کی اعلیٰ لیاقتوں کے بیان کرنے کے لئے ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

حیات النذیر میں مصنف نے مولانا نذیر احمد کی زندگی، اُن کی طرز ماندو بود، اُن کے اخلاق و عادات، اُن کے اوقات و مشاغل، اُن کے اعتقادات، ان کی رایوں کا جو صحیح نقشہ خود انھیں کی تصنیفات و تصریحات کی بنا پر کھینچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات مذکورہ کے تفحص اور جستجو میں سعی و کوشش کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اس مقصد عظیم کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک بڑے آدمی کی سچی بیوگرافی سے جو گراں بہا فائدے آئندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں اُن کے پہنچانے میں تابمقدور کوتاہی یا بخل نہ کیا جائے۔

اس بیوگرافی کے متعلق ہم ریویو نگاری کا فرض ادا کرنے کی غرض سے مصنف کی خدمت میں ایک عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے جس طرح شاید ترجمۂ نذیریہ کی فوقیت ظاہر کرنے کے لئے اُس کا موازنہ دیگر جدید ترجموں سے کیا ہے اسی طرح کتاب الحقوق والفرائض مرتبہ مولانا نذیر احمد کے بعض مقامات کا موازنہ حجۃ اللہ البالغہ کے ہم مضمون مقامات سے کیا ہے اور الحقوق والفرائض کے بیانات کو حجۃ اللہ البالغہ کے بیانات پر ترجیح دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا یہ بیان مولانا کی نظر سے نہیں گذرا اور نہ ہرگز توقع نہیں کیجا سکتی کہ وہ مصنف کو ایسی دلیری کی اجازت

دیتے۔

مصنف نے شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت شمس العلما ر مولانا شبلی کے اس قول کو نہایت تعجب سے دیکھا ہے کہ شاہ صاحب کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے۔ اس ریویو میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ شمس العلمار کی رائے کی تائید دلائل کے ساتھ کیجائے۔ لہذا یہاں ہم خواجہ حافظ کے مشہور شعر پر اکتفا کرتے ہیں ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

رسالہ "اردو"

(منقول از رسالہ "اردو" لاہور بابت اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۲-۲)

مولوی فتح محمد خاں مرحوم جالندھری نے "اردو" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ لاہور سے نکالا تھا اس کا پہلا ڈبل نمبر ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ ناقدری کی وجہ سے دو ہی تین نمبر نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔

"اردو" اس نام کا ایک رسالہ پنجاب کے نامور مصنف جناب مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری نے انھیں دنوں میں شہر جالندھر سے نکالا ہے جس کا پہلا نمبر میری نظر سے گذرا۔ تقریباً دس برس کا عرصہ گذرا ہوگا کہ پٹیالہ کے مشہور مدبر و رکن ریاست مرحومی جناب خلیفہ سید محمد حسین خاں صاحب بالقابہ نے ایک صحبت میں فرمایا تھا کہ ملک میں ایک ایسا رسالہ جاری ہونے کی سخت ضرورت ہے جس کا مقصد براہ راست محض اردو زبان کی خدمت اور اُس کے لٹریچر کی اصلاح ہو۔ اگرچہ اُس وقت تمام حاضرین نے بالاتفاق اس ضرورت کو تسلیم کیا تھا، مگر گذشتہ دس سال میں نہ اُس پر کچھ عمل درآمد ہوا اور نہ کسی کو وہ بات یاد رہی۔ مگر اصلی اور حقیقی ضرورتوں سے کیسی ہی بے اعتنائی یا بے پروائی کیجائے وہ کبھی نہ کبھی ضرور پوری ہو کر رہتی ہیں، کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ بغیر کسی کی تحریک کے خود بخود اس کے پورا کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ رسالہ جس کا نام "اردو" رکھا گیا ہے اسی ضروری مقصد کے لئے جاری کیا گیا ہے اگرچہ ابھی تک اُس کا صرف ایک نمبر شائع ہوا ہے جس سے اُس کے مستقبل کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے "سالے کہ نکوست از بہارش پیدا است" ہم کو قوی امید ہے کہ یہ رسالہ مقبول خاص و عام ہوگا۔ اول

توجو مضامین پہلے نمبر میں شائع ہوئے ہیں وہ نہایت دلچسپ اور رسالے کے مقصد کے لحاظ سے نہایت موزوں ہیں۔ دوسرے رسالے کا مقصد ایسا اہم اور ضروری ہے جو پبلک کو بزور اُس کی طرف متوجہ کرے گا۔ تیسرے دہلی جو اُردو زبان کا مرکز ہی اُس کا دارالخلافہ بننا رسالے کی اشاعت کے حق میں خود ایک بڑی فال نیک ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہی کہ جس زبردست ہاتھ میں رسالے کی باگ ہے وہ ہاتھ ہی اُس کی ترقی اور قیام کا ضامن ہی۔

ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ تمام ملک میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے اور اردو زبان کو اُس سے خاطر خواہ فائدہ پہنچے اور مالک و مہتمم کی مساعی جمیلہ مشکور رہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خمخانۂ جاوید

(جلد دوم)

اُردو شاعروں کا سب سے زیادہ ضخیم تذکرہ ہے جس کو جناب لالہ سری رام ایم، اے نے مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ ابھی ۵ جلدیں ختم ہوئی تھیں کہ مؤلف کا انتقال ہو گیا۔ اس کی باقی جلدیں جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ترتیب دے رہے ہیں۔ (از "خمخانۂ جاوید" جلد دوم مطبوعہ ۱۹۱۱ء)

خمخانۂ جاوید، یعنی تذکرہ شعرائے اُردو زبان مرتبہ جناب لالہ سری رام ایم۔اے رئیس دہلی خلف الصدق جناب آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال سرگباشی۔ اس تذکرے کی جو اہمیت میرے دل میں ہے اور جو خصوصیت مجھکو صاحب تذکرہ اور اس کے معزز خاندان سے حاصل ہے اس کے لحاظ سے مجکو اس کی پہلی جلد پر سب سے پہلے اپنے خیالات ظاہر کرنے چاہیئں تھے مگر بدقسمتی سے ایسے مکروہات پیش آتے رہے کہ میں اطمینان کے ساتھ اس کی نسبت کچھ نہ لکھ سکا۔ اگرچہ کافی اطمینان اب بھی میسر نہیں ہے لیکن چونکہ تذکرے کی دوسری جلد بھی عنقریب چھپ کر شائع ہونیوالی ہے اس لئے میں نے خیال کیا کہ مبادا اس اہم تالیف کی نسبت پھر مجکو اپنے دلی خیالات ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے، لہٰذا میں نے نہایت ضروری سمجھا کہ اپنی ناچیز رائے اس کے متعلق ظاہر کرنے میں اب دیر نہ کروں۔

اس تذکرے کی پہلی جلد کو چھپے ہوئے تین برس گزر چکے ہیں۔ دہلی و لکھنؤ اور اطراف ہندوستان کے بڑے بڑے نامور شعرا اور اہل کمال نے اس پر نہایت

عمدہ رائیں ظاہر کی ہیں جس صفائی اور سلاست سے اس میں شعرا کے تراجم لکھے گئے ہیں اور جس سلیقے سے ان کا کلام انتخاب کیا گیا ہے اور جس کوشش و جانفشانی سے ان کے حالات اور اُن کا کلام بہم پہنچایا گیا ہے اور جس ادب و احترام کے ساتھ قدما سے لے کر معاصرین تک سب کا نام لیا گیا ہے، ان سب باتوں کو تقریبًا تمام تقریظ نگاروں نے تسلیم کیا ہے اور سب سے بڑھ کر میں نہایت صدق دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ پس تذکرہ یا تذکرہ نویس کو پبلک سے روشناس کرانے کی اب زیادہ ضرورت نہیں ہے میں اس موقع پر صرف تذکرے کی جامعیت کی نسبت چند الفاظ لکھنے چاہتا ہوں۔

اب تک اس تذکرے کی صرف پہلی جلد راقم کی نظر سے گزری ہے جو ۶۸۹ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ اُس کے دیکھنے معلوم ہوا کہ اس جلد میں صرف ان شاعروں کا کلام اور ان کے حالات درج ہوئے ہیں جن کا تخلص الف یا بے سے شروع ہوتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ منجملہ تین کے صرف دو ردیفیں اس جلد میں قلمبند ہوئی ہیں اور کم سے کم ۱۸ ردیفیں باقی ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر سب ردیفیں اسی شرح وبسط کے ساتھ لکھی گئیں جیسی کہ الف اور بے کی ردیفیں لکھی گئی ہیں تو یہ تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے بلا مبالغہ شعرائے اردو زبان کی ایک ایسی سائیکلو پیڈیا ہوگا جس کی نظیر اردو تذکروں میں نایاب سمجھی جائے گی اور اُردو زبان میں یہ ایک ایسا اضافہ ہے جس کا تمام اہل ملک کو ممنون ہونا چاہیے۔ آج کل اہل ملک کی بدقسمتی سے جو اختلاف ہندو مسلمانوں میں اُردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی رفعدا اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریقے سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اُردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے اسی طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے عزیز ہیرو نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور مسلمان مصنفین

بے ضرورت اُردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اُردو کو مالامال کرنے میں کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک متنازع فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں، جیسی کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہل دہلی کی زبان تھی۔ مذکورۂ بالا اختلاف کے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طول طویل مدت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں، مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابل التفات نہیں سمجھا اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً وہ ہمیشہ بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالانکہ جو اُردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گرامر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر پر ہے۔ عربی، فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسما اس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم یا نثر مفید معنی نہیں ہو سکتی، برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ "دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر"۔

قصہ مختصر جس ذوق و شوق سے معزز مؤلف نے اس تذکرے کے لکھنے پر کمر باندھی ہے اور جس استقلال کے ساتھ وہ طالب علمی کے زمانے سے لیکر آجتک ان تمام مشکلات پر غالب آتے رہے ہیں جو اس مفید کام کے انجام دینے میں اُن کو پیش آئیں اُس نے اس عام خیال کی بوجہ احسن تردید ہوتی ہے کہ انگریزی تعلیم بجائے اس کے کہ قومی تعصبات سے دلوں کو پاک کرے اور اُلٹی تعصب و ناگواری کی آگ ملک میں مشتعل کرنے والی ہے۔

بہرحال ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ جو مفید کام ہمارے دلی دوست مسٹر سریرام صاحب نے شروع کیا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے بخیر و خوبی انجام کو پہنچائے اور اس تصنیف کو قبول عام کے زیور سے آراستہ فرمائے۔

آخر میں ہم معزز مصنف کی خدمت میں اس بات کے عرض کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ صفحہ ۳۰۸ پر جہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کا حال لکھا گیا ہے اس میں چند فرو گذاشتیں ہوگئی ہیں، اول تو شاہ صاحب ممدوح کا اُردو زبان میں شعر کہنا اور اشتیاق تخلص کرنا ثابت نہیں ہوا۔ دوسرے ان کا وطن سرہند اور مجدّد الف ثانی کی نسل سے ہونا اور فیروز شاہ کے کوٹلہ میں سکونت پذیر ہونا غلط معلوم ہوتا ہے۔ کسی طریقہ سے اس غلطی کی اصلاح فرما دیجائے۔

کلّیاتِ دلگیر

کلیات دلگیر ایک خاص نوعیت کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مولانا حالی سے اس کلیات کو عوام سے روشناس کرولنے اور اس کے محاسن ظاہر کرنے کی فرمائش کی گئی تھی جس پر مولانا نے یہ ریویو لکھا۔ ریویو سب سے پہلے دسمبر ۱۹۰۱ء کے "معارف" میں شائع ہوا۔ پھر مولانا وحیدالدین سلیم نے اس کو "مضامین حالی" میں شائع کیا۔ (از "مضامین حالی" صفحہ ۲۳۵ مرتبہ مولانا وحیدالدین سلیم ۱۹۰۴ء)

کلیات دلگیر ایک نئی قسم کا دیوان ہے جس سے غالبًا خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ صاحب دیوان ایک بزرگ منور خاں نام دلگیر تخلص رئیس میرٹھ ہیں ۱۸۵۰ء میں انھوں نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں جو درمیان دوآب و ہریانہ کے دیہات میں عمومًا بولی جاتی ہے، لکھ کر مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کی حضور میں پیش کی تھیں۔ وہاں اُن نظموں کی بہت داد ملی اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا۔ اس قدر دانی نے میاں دلگیر کے خیالات پر وہی اثر کیا جو سلطان سنجر کے ملک الشعرا کا تزک و احتشام دیکھ کر اوحدالدین انوری کے دل پر ہوا تھا۔ انھوں نے اُسی گنواری زبان پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کر لیا جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔

میرے ایک لائق دوست نے جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتے ہیں مجھ سے یہ فرمائش کی ہے کہ اس دیوان میں جو شاعرانہ خوبیاں اور محاسن ہیں، ان کو کسی قدر پبلک پر ظاہر کروں اور لوگوں سے میاں دلگیر اور ان کے کلام کو روشناس کراؤں۔

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے وہ درحقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی اُردو ہے۔ جیساکہ ہر ملک میں دیہاتیوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی ہوئی زبان ہوتی ہے پس اس دیوان میں زیادہ تر وہی الفاظ جو فصیح اُردو میں صحیح طور پر مستعمل ہوتے ہیں کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال ہوتے ہیں جیسے خالق اور کھالک، باپ اور باپو، ہمارے اور مھارے، بچے اور بچے اور چھیاں چیاں، تونے اور تیں نے، کیا اور کینا، دیا اور دینا، وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو جس کی مادری زبان شہری فصیح اُردو ہو، بگڑی ہوئی اُردو سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے مگر جو بات دشوار اور سخت دشوار ہے اور جس پر سوا اُس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوا ہو کوئی قادر نہیں ہو سکتا، وہ یہ ہے کہ جو مضمون ایک گنواری زبان میں بیان کیا جائے اس کا پیرایۂ بیان بھی گنواروں کے محدود خیالات کی حد سے متجاوز نہ ہو۔ کیونکہ فصاحت درحقیقت اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے کہ مثلاً اگر بچوں کے ساتھ بات چیت کرو تو بچے بن جاؤ اور گنواروں کے ساتھ گفتگو کرو تو اپنے تئیں ٹھیٹ گنوار بنالو جیساکہ کہا گیا ہے

اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے جو دلمیسر کے اصلی اور قدرتی شاعر ہونے پر بآواز بلند گواہی دیتی ہے۔ جس طرح اس کی زبان گنواری ہے اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے۔ وہ خدا کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے۔

ہے مرے کھالک! ہے مرے مالک! تو باپو ہم تیرے بالک

(ہے = حرف ندا یعنی اے۔ کھالک = خالق۔ باپو = باپ) خدا کی عظمت کا بیان گنواروں کے خیالات کے موافق اس سے بہتر کسی پیرایہ میں نہیں ہو سکتا کہ اس کو باپ اور اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں۔

مھارے(۱) حاکم ہو، مھارے سوائی(۲) چیاں چیاں(۳) تیری دُہائی

(۱) ہمارے (۲) سردار (۳) بچے بچے

تیں[۱] پانی سوں مانس[۲] کیتا[۳] — سوجھ بوجھ مت سدھ بدھ دینا[۴]
تیرے سانچے اینک[۵] نرالے — جن سانچوں[۶] لکھ کایا ڈھالے

خدا کی حکمت بالغہ کو جو قرآن میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے کہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ تیرے سانچے بے شمار اور ان گنت ہیں کہ ایک سانچے کی ڈھلت دوسرے سانچے کی ڈھلت سے نہیں ملتی -

انبر[۷] دھرتی ، سورج ، چندر — ولی[۸] ، دیوتا ، پیر ، پیغمبر[۹]
سب تری ڈوڈھی[۱۰] سیس[۱۱] نوادیں[۱۲] — تجھے[۱۳] نے پوجیں تجھے نے گاویں[۱۴]
جے[۱۵] تو اپنا چھوہ[۱۶] دکھاوے — انبر[۱۷] دھرتی[۱۸] چھو[۱۹] ہو جاوے[۲۰]
توں[۲۱] بیڑے کا کھیون[۲۲] ہارا — تیرے ہاتھوں ہے نستارا[۲۳]
آئے پڑی منجدھاروں[۲۴] نیا[۲۵] — تجھ بنا دیکھے ناہیں[۲۶] کھویا[۲۷]
توں نیا[۲۸] نو پار لگا دے — مجھ ڈوبے نوں[۲۹] تو ہی تراوے
توں ہی مارے تو ہی نواجے[۳۰] — تیرا دھونسا[۳۱] انبر باجے[۳۲]

چونکہ بادشاہوں اور امیروں کے نقار خانے بہت بلندی پر بنائے جاتے ہیں تاکہ نوبت کی آواز دور دور پہنچے اور سننے والوں کو ان کی زیادہ شان و شوکت معلوم ہو۔ اس لئے عوام کے خیال کے موافق عظمت و جلالت الٰہی کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے کہ تیرا نقارہ آسمان پر بجتا ہے۔

---

(۱) تونے (۲) آدمی (۳) بنایا (۴) دیا (۵) بیشمار (۶) لاکھوں جسم (۷) آسمان (۸) اوتار (۹) پیغمبر (۱۰) ڈیوڑھی (۱۱) سر (۱۲) جھکائیں (۱۳) تجھی کو (۱۴) تیرا نام لیں (۱۵) اگر (۱۶) غصہ (۱۷) آسمان (۱۸) زمین (۱۹) سب فنا (۲۰) ہو جائے (۲۱) تو (۲۲) ملاح (۲۳) نجات (۲۴) یعنی منجدھار میں (۲۵) کشتی (۲۶) نہیں (۲۷) کھینے والا (۲۸) کشتی کو (۲۹) کو (۳۰) نوازے (۳۱) نقارہ (۳۲) آسمان پر بجتا ہے۔

سورج کاڈھے[1]، چندر چمکاوے — پربت ڈھاوے[2] سمندر[3] بھاوے
توہی لاڑے[4] میگھ ملارا[5] — توں ہی بوا وے بوہنڈا[6] مھارا[7]
توں کھیتاں نوبیاں چلاوے — توں پودا تو دھوپ لگاوے
کھیت اگاوے ناج پکاوے — سگری[8] پرجا، جا[9] تو کھاوے

سورج اور چاند کا نکالنا، پہاڑوں کا بلند کرنا، سمندر کا بہانا، مینہ برسانا، زمین بوانا کھیتی پر ہوا چلانا، اُس پر دھوپ نکالنا، بیج اگانا، اناج پکانا اور اس سے ساری مخلوق کی پرورش کرنا، یہ سب ایسے صاف اور کھلے ہوئے مظاہر قدرت ہیں جن سے بڑھ کر خدا کی عظمت و جبروت کا خیال خاص کر ایک زراعت پیشہ دیہاتی گنوار کے دل میں کسی ذریعہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

تجھ[10] بنا جن کوئی دوجا پوجا[11] — واکی[12] انکھاں نیل کا سوجا
وین دُنی کی کھوئی کھوبی[13] — واکی[14] نیّا[15] ریت میں ڈوبی
ہے مرے صاحب بکسن[16] ہارے — پاڑ دئے[17] کھوٹے کا گدّ[18] مھارے
توں ہی مھارا پالن ہارا — تیرا اَن[19] کھاوے جگ سارا
دلمیرا ہے تیرا وا[20] ہی — توہی دے گا تاتی[21] باسی

یہ چند بیتیں اس نظم میں سے لی گئی ہیں جو دلمیسر نے اپنے دیوان کے شروع میں حمد الٰہی میں لکھی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ہر شخص جو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے بخوبی

---

(۱) نکالے (۲) اٹھاوے یعنی بلند کرے (۳) سمندر (۴) نکالے یا برسائے (۵) باران رحمت (۶) کھیت (۷) ہمارا (۸) ساری مخلوق (۹) جس کو (۱۰) تیرے سوا جس نے (۱۱) پوجا (۱۲) اس کی آنکھوں میں سوا یعنی سلائی (۱۳) خوبی (۱۴) اس کی (۱۵) کشتی (۱۶) بخشنے والا۔ (۱۷) پھاڑ دے (۱۸) کاغذ یعنی نامۂ اعمال (۱۹) رزق (۲۰) غلام (۲۱) گرم یعنی تازی روٹی

اندازہ کرسکتا ہے کہ صاحب دیوان جس طرح گنواری زبان اور اس کے محاورہ روزمرہ پر پوری قدرت رکھتا ہے اسی طرح وہ ہر ایک مطلب کو گنواروں کے خیالات اور ان کے مبلغ فکر کے موافق اُسی گنواری زبان میں ادا کرتا جانتا ہے۔

حمد کے بعد نعت میں اس مطلب کو کہ آنحضرتؐ قیامت کو ہماری شفاعت کرینگے، اس طرح ادا کرتا ہے "جگ پرلوں مھاری مکتان اوٹی"

پھر اس مطلب کو کہ آپ کے چاروں یاروں نے دنیا میں اسلام کو پھیلادیا، اس طرح بیان کرتا ہے۔

نبی صاحب کے چار سپائی(۱) — جنھاں(۲) نے ملکوں دھومیں(۳) ٹھائی
کردئے لکھوں نیم(۴) کے بندے — زبل(۵) ہوگئے ماڑنس(۶) گندے

پھر اس مطلب کو کہ جس نے آنحضرت کی پیروی نہ کی وہ تباہ ہوا اس طرح ادا کرتا ہے۔

جو کوئی(۷) واکی گیل(۸) نہ چالا — واکا(۹) دوجگ مہنڈا(۱۰) کالا
ڈوب گیو وہ کرموں ہینا(۱۱) — جن(۱۲) حجرت(۱۳) کا سنگ(۱۴) نہ لینا

ایک شخص اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور جاپڑا ہے، گویا وہ خدا کی طرف مخاطب ہوکر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے

ہے مرے(۱۵) صاحب! یو(۱۶) کے کینا(۱۷) — مجھ(۱۸) نے دیس نکاڑا(۱۹) دینا
میں(۲۰) نے کے تیری بھوریں(۲۱) کھیدیں — جے مرنے کا(۲۲) جے برچھی چھیدیں

---

(۱) سپاہی (۲) جنھوں نے (۳) دھوم مچائی (۴) ایمان (۵) پاک (۶) آدمی (۷) اس کی (۸) ہمراہ (۹) دو نوجہاں میں (۱۰) منہ (۱۱) نصیبوں کا ہیٹا (۱۲) جس نے (۱۳) حضرت (۱۴) ساتھ نہ لیا (۱۵) اے میرے خدا (۱۶) یہ کیا (۱۷) کیا (۱۸) مجھے دیس نکالا یعنی جلاوطنی (۱۹) دیدی (۲۰) میں نے کیا (۲۱) تری بھوری بھینس نکال لی ہے۔ (۲۲) کہ تو نے مرے کلیجہ میں برچھی چبھودی ہے۔

اپنے صاحب یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہو جو تو نے مجھ پر یہ مصیبت ڈالی ہے۔ چونکہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اس لئے انھیں کے خیالات کے موافق خدا سے کہتا ہو کہ کیا میں نے تیری بھوری چھین لی ہو جس کا تو نے مجھ سے یہ بدلہ لیا ہے۔

چھٹ گئے سگڑے[1] ناتی گوتی[2] — دادا نانا پوت[3] پڑ[4] دوتی

ناؤ[5] بامن[6]، ہالی[7]، گمیرٹے[8] — جنھاں[9] نت میرے ڈانگر گھیرے

کہاں گئے اوہ[10] ایکھ کے گانڈے[11] — کہاں گئے اوہ بینڈے[12] ڈانڈے

کہاں گئی اوہ کھیتی مھاری — کہاں گئی اوہ گاجر کیاری

اسی طرح کہیں جتی سے اور چوپاڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہو، کہیں بھابھڑ کے بانوں سے بُنی ہوئی کھاٹ، کھٹولی، گوبر کی ڈھیریوں، سانی کی ناندوں، دودھ دہی کی کوری مٹکیوں، سرسوں کے ساگ اور مکا کی روٹی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دیہاتی زندگی کے مناسب ہیں حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہو کہ ظاہرا دلگیر سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مدون نہیں کیا اور نہ اتنے مختلف مضامین جتنے کہ اس دیوان میں ہیں کبھی اس زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں حمد و نعت منقبت اخلاق، مدح، ہزل عشق، ہجر وصل، رشک غرضکہ وہ تمام بیانات جو اردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں، موجود ہیں لیس اردوئے معلیٰ کے شعرا جو کئی سو برس

---

(۱) سالے (۲) رشتہ دار (۳) بیٹا (۴) پوتے کی بیٹی (۵) نائی (۶) برہمن (۷) ہل چلانیوالا (۸) خادم (۹) (جو ہمیشہ میرے مویشی گھیر گھیر کے لاتے تھے) (۱۰) وہ (۱۱) گنّے (۱۲) کھیت کی ڈول اور پگڈنڈی۔

سے اسی ایک ہڈی کو چچوڑتے چلے آتے ہیں، اُن میں اور دلمیسر میں وہی فرق ہے جو مقلد اور موجد میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جب مضامین مذکورۂ بالا میں کسی مضمون کو باندھنا چاہتے ہیں تو اس کے ادا کرنے کے لئے سینکڑوں اسلوب بیان اور الفاظ و محاورات و تراکیب اُردو لٹریچر میں مہیا پاتے ہیں، ان کے سامنے مختلف مقدار کے بندھے ہوئے موتیوں کا انبار موجود ہے، جیسے موتی کی ضرورت ہوتی ہے بے تکلف لڑی میں پرو لیتے ہیں۔ برخلاف اس شخص کے جس کو اول غوطہ لگا کر دریا میں سے سیپیاں بہم پہنچانی پھر اُن میں سے موتی نکالتے ہیں پھر ان کو جلا کرنا ہے پھر بیندھنا ہے پھر لڑی میں پرونا ہے۔

اس سے زیادہ مشکل یہ بات ہے کہ گنواری زبان ایک جاہل قوم کی زبان ہے جس کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے۔ باوجود اس کے دلمیسر نے اس میں بہت سے ایسے مضامین بیان کئے ہیں جن کا ایک گنواری زبان میں سماجانا سخت مشکل ہے مثلاً انگریزی عملداری کی تعریف میں نوایجاد توپوں اور بندوقوں کا بیان، ریل، تار برقی سڑکوں اور نہروں کا بیان، برف کی کل اور واٹر ورکس کا بیان، دیا سلائی، گیس اور برقی روشنی کا بیان وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا بیان میں سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں:-

جگ[1] جگ رہے پھرنگی راج — پورا[2] جے، راجوں سرتاج
راجا راجی، سکھی کسان — پورا[3] جا، پرجا کی جان
بڑے باد[4] چھا، بڑے نسا[5] پھ — بڑے اکل[6] ور، بڑے سرا[7] پھ

---

(۱) ہمیشہ ہمیشہ (۲) (یہ بادشاہ بادشاہوں کے سرتاج ہیں) (۳) راجا (۴) بادشاہ (۵) انصاف (۶) عقلور (۷) اشراف

انگریجاں کا ملکوں راج — راجا بڈے گریب نواج
انگریجاں کی بانکی پھوج — جا بڈ[1] چڑھے سمندر موج
بڑے سمندروں گھنی جہاج — جامیں[2] راکھیں بھر بھر ناج
کھاوے پھوج، انگھاوے[3] پھوج — بیٹھی باجے بجاوے پھوج
توپاں چلیں گھٹ گھنگور — کاسوں[4] ہو سرکار کی ہوڑ[5]
تورا[6] لگے نہ دارو[7] موکہنہ[8] — ایو آپو چلیں بندوکہ
ہند[9] بندوکاں لمبی نال — داگی[10] دگیں نہ دو دو سال
ہند راج کھوٹی تروار — گاجر کٹے نہ سو سو مار
راج پھرنگی رہے انند — جدلگ انبر، سورج، چند
ریل لگا ڑی[11] کاڈھے تار — دن میں چالے میل ہجار
تار کھبر سوں راتوں رات — لاکھ کوس سوں کرلو بات
اچرج بڑی برپھ[12] کی کل — وا[13] سے گھوماوے کونسائل[14]
کاگج دام جلاوے کون؟ — ایسا ٹھاڈا آوے کون؟
سڑکاں[15] بنائیں کھودیں نہر — کھیت کھیت پانی کی لہر
جاسے ہو لکھوں من ناج — کدھیں[16] رہیں ناٹھا[17] لی چھاج
بمبے دئے دھرتی ماں گال — تلے تلے پانی کی چال
بگڑہ بگڑ ماںھ[18] لائے[19] نل — جامیں آوے نرمل جل

---

(۱) جن میں (۲) جن میں (۳) سیر ہو (۴) کس سے (۵) برابری (۶) توڑا (۷) بارود (۸) پیالہ میں (۹) ہندوستان کی بندوقیں (۱۰) داغنے سے نہیں دغتیں (۱۱) نکالی (۱۲) برف (۱۳) اس کو (۱۴) پہلوان (۱۵) سڑکیں بنائیں نہریں کھودیں (۱۶) بیکار (۱۷) دیکھیے زمین میں لگائے (۱۸) میں (۱۹) لگائے

یا ہی بُدسوں جلیں چراگ — نا باتی ، نا تیل ، نہ آگ
نا کوئی دیوا بالن[1] واڑا — آپو آپو ہو اُجیاڑا[2]
آپو ترڑکے[3] جا دیں بجھ — اچرج[4] مانیں مجھ اور تجھ
بڈے بڈے پر جانو سکھ — ناہیں رہے اب دھرتی مو کھ

اب ہم چند اشعار دلگیر کی غزلوں میں سے بطور نمونے کے نقل کرتے ہیں۔

آجا مھارے منتر[5]! آجا — مواڑا ہوں[6] موئے جوا[7] جا
پیت نہ کرلے ، میت کسی کی — پیت نہ چھوڑے کوٹھی ناجا[8]
ہی من اُوت[9]! گیو کے تیرو ؟ — مھارنے[10] ہی اوپر دھونسا باجا

باوڑے[11] من ! یو کے کینا؟ — من ، دھن سگرا تیاگی[12] دنیا
پیت[13] لاکے[14] پر تیت[15] گنوادی — پھٹ پھٹ بیری ! تیرا جینا
ایک[16] دنا نو کہکے گیو ہے — بیت[17] گیو اب ایک مہینا
مھارا گات[18] سند[19] ھنے تیرے — رین[20] دنا[21] پہلا[22] سا پینا

ناہیں رہو من بیری بس کا — یا نے[23] پڑ گیو چسکا جوبن رس کا
بیٹھ گیو دیہل[24] یتم[25] لڑکی — کسی کا نا کھسکا[26] یا کھسکا

---

(۱) روشن کرنیوالا (۲) اجالا (۳) صبح کو (۴) اچنبھا (۵) دوست (۶) مجھے (۷) جلا جا (۸) غلہ (۹) اے احمق دل تیرا کیا گیا (۱۰) یعنی مصیبت ہمیں پر آپڑی (۱۱) اے باؤلے دل (۱۲) منفعت دیدیا (۱۳) محبت (۱۴) لگا کے (۱۵) عزت (۱۶) ایک دن کو کہکے گیا ہی (۱۷) گذر گیا (۱۸) بدن (۱۹) غم سے (۲۰) رات (۲۱) دن (۲۲) روئی کی طرح (۲۳) اسکو (۲۴) چوکھٹ (۲۵) معشوق (۲۶) کسی کا ہٹایا نہ ہٹ

ہیں کیلی تو نے بن بن ڈھونڈوں   تو تو جوڑا بچھڑ گیو سارس کا

دو ڑیو سٹے دو ڑیو میرے بگڑ دھاڑا اپڑا   ناج کھایو۔ مال کھوسا[1] ایک چھوری[2] نے ہڑا[3]
توں مڑ دوٹے[4] سیج[5] مارے سانجھ[6] سوں تڑ[7] کا لگا   میں لکھاؤں[8] بات تیری گا نو کے گوٹے[9] کھڑا
تیر ڑکاں[10] سوں چلاوے سین[11] مارے نین[12] سوں   کے گیو[13] تیرو کو کرمی[14] اٹھوڑ میں مارا پڑا
مات کھائی لات کھائی دھول جوتی اوٹلی   ہو گیا دلگیر! توں تو اسک[15] ماں چکن[16] گھڑا

اسک کر بگا پھجیت[17] ہو گی اسک[18] کری مت پرے بیرا   بوئے کھیت[19] رنڈ کے پودا کن کھائے گگڑی کھیرا
باڈھی[20] کے نے پران گنوائے اسک لائے[21] کے سیری سے[22]   کھسر[23] کی تو موچھ نہ کھوسی[24] آپوا پنا سر چیرا
لیلیٰ پاچھے ہوو[25] باوڑا[26] مجنوں[27] کی کر مت ہینی   سگری پاگ[28] ٹوک کر لاڑی لتا[29] سگ لیرم لیرا
ہیر تمائی[30] ہوئی دوانی، رانجھے لیکے دکھ[31] اوٹھائے   بیت کروں[32] پر تیت جانے ہی بیت نکرے دلگیرا!

لا رے[33] کلاڑکے! پھول سراب[34]   سینہ[35] دمکے جیسے گراب[36]
پانو پاگ[37] ہاکا گھ[38] میں جوتی   ایسی دارو[39] پیو زناب[40]

---

(۱) چھینا (۲) لڑکی (۳) لوٹ لیا (۴) کروٹیں (۵) سیج پر (۶) شام سے (۷) صبح نکلنے تک (۸) دیکھوں (۹) قریب (۱۰) پلکوں سے (۱۱) اشارے (۱۲) آنکھ سے (۱۳) کیا گیا تیرا (۱۴) اے ظالم! یعنی مارا تو میں گیا (۱۵) عشق (۱۶) چکنا گھڑا (۱۷) فضیحت (۱۸) عشق (۱۹) بوکر کھیت میں ارنڈ کے پودے کس نے کھایا ہی گگڑی کھیرا (۲۰) بڑھئی کے بیٹے فرہاد نے (۲۱) لگا کے (۲۲) شیریں سے (۲۳) خسرو (۲۴) کھسوٹی (۲۵) ہوا (۲۶) باولا (۲۷) مجنوں کی کیسی بودی عقل تھی۔ (۲۸) ساری پگڑی ٹکڑے کر ڈالی (۲۹) لتے سارے لیر لیر ہو گئے (۳۰) بھولی (۳۱) اٹھانے (۳۲) بیت کہہ کر (۳۳) اے کلال والے (۳۴) عمدہ شراب (۳۵) بوتل (۳۶) گلاب (۳۷) پانو پر پگڑی (۳۸) بغل میں جوتی (۳۹) شراب (۴۰) جناب

گھوڑے چڑھ کے چلے نسے میں　　پانو پاسَر(۱) گلے رکاب
آئے صاحب جنگل میں　　ہاتھ ہتھوٹے(۲) پانو جراب
اونچا کوٹ لمبی پتلون　　یوہی پہارسے بڑے نباب(۳)
دارو پی کے ٹہلن لاگے　　موتھہ مان چرٹ ہاتھ کتاب
تون دلبرا جیب(۴) کا پھوڑا　　یا جیبا(۵) نو دانتوں(۶) داب
موتھہ ماں بان(۷) چلائے جیب　　سگڑی(۸) آپھت(۹) ڈھائے جیب
یا جیبا کے سگڑے کھوٹ　　بھیّوں(۱۰) راڑ(۱۱) کرا دے جیب
کدھیں(۱۲) تو بولے امرت بول　　کدھیں بکھ کھنڈا(۱۳) دے جیب
پٹ سوں(۱۴) بول اباؤ(۱۵) کے بول　　ترت پھرت لک جائے جیب
جیب(۱۶) کہا ہے تنک سی جونک　　لہو ماس کھا جاوے جیب
دھرتی(۱۷) پا لکھوں کرے بگاڑ　　انبر آگ لگاوے جیب
یوہی گیرے(۱۸) نرکھوں کھنڈ　　یوہی سُرگ(۱۹) کمائے جیب
تون دلبرا جیب کے بس میں　　تیری کوئی کٹاوے جیب

افسوس ہے کہ اس دیوان میں جتنے اصناف کا کلام ہے ان سب کا نمونہ ہم نہیں دکھا سکتے کیونکہ بہت سے اشعار ہزل بلکہ فحش کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اس میں زیادہ تر ہماری سوسائٹی کا قصور ہے۔

---

(۱) پانو پر سر اور گلے میں رکاب (۲) دستانے (۳) نواب (۴) زبان کا پھوڑا۔ (۵) اس زبان کو (۶) دانتوں تلے داب (۷) تیر (۸) ساری (۹) آفت (۱۰) بھائیوں میں (۱۱) تکرار (۱۲) کبھی (۱۳) زہر (۱۴) جلدی سے (۱۵) فساد کے بول بولکر (۱۶) جیب کیا ہے ذرا سی جونک (۱۷) زمین پر (۱۸) ڈالے نرکھ کے کھنڈ میں (۱۹) بہشت

جس کے خوش کرنے اور جس سے داد لینے کے لئے شاعر کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ کہیں کہیں تہذیب کی حد سے متجاوز ہو کر سامعین کے دل کو لبھائے جائیں یہی وہ مجبوری ہے جس نے ہماری شاعری کو گندہ اور ناپاک کر دیا ہے۔ لیکن اگر اس دیوان میں سے غیر مہذب اشعار نکال دئے جائیں تو بھی ایک معتد بہ مجموعہ مہذب اور شائستہ کلام کا باقی رہتا ہے جو صاحب دیوان کی ایک عمدہ یادگار رہ سکتا ہے۔